ISSN 0974-7346

اپریل ۲۰۲۵ء
جلد۲۱۲ــــعدد ۴

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ
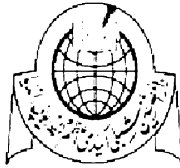
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰؍روپے۔ فی شمارہ ۴۰؍روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰؍روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰؍روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰؍روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام:Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر:4761005500000051

آئی ایف ایس سی:PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کو CSR کی منظوری مل گئی ہے۔اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۲ | ماہ شوال ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۲۵ء | عدد ۴

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

رمضان المبارک کے آخری عشرے کا ایک عمل اعتکاف ہے اور ان آخری دس دنوں کی ایک خوبی یہ بھی بتائی گئی کہ ان میں جہنم سے آزادی کی نوید ہے۔ اصلاً ایک کامیاب قوم یا ایک قوم کی کامیابی کے لیے یہ دو پیمانے بھی ہیں۔ خاموشی، تفکر، تنہائی اور پاکیزگی کے ماحول میں خود کے جائزہ اور احتساب اور اس کی اہمیت کو سمجھنا اور پھر مصائب و آلام اور ہر قسم کے عذابوں سے نجات کی راہ تلاش کرنا، کامیابی اور کامرانی کے لیے اور کیا چاہیے؟ دنیا کے کئی خطوں کے علاوہ ملک عزیز میں اعتکاف اور عتق من النار کے عمل و نتیجۂ عمل پر ایمان رکھنے والوں کے لیے آزمائشوں کا ایک سلسلہ ہے جو بظاہر نہ رکنے والا ہے اور نہ ختم ہونے والا ہے۔ وقتِ دعا کے ساتھ عجب وقت کے آن پڑنے کی فریاد ایک زمانے سے ہے لیکن موجودہ حالات میں یہ فریاد جتنی تلخ اور روح فرسا ہے، وہ یہی کہتی ہے کہ سراپا درد اور حسرت بھری کوئی اور مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ خصوصاً ملک عزیز کے روز و شب بلکہ ہر لمحہ بجائے خود ایک نیا زخم بنتا جاتا ہے۔ قوم کا پورا جسم ہی چھلنی ہوا جاتا ہے اور کہیں سے کسی مسیحائی کی جیسے آس بھی نہیں نظر آتی ہے۔ ایک آزاد ملک میں آزاد قوم کے تمام حقوق و اختیارات کی ضمانت لیے ہوئے، ملک کی ایک بڑی آبادی کی مذہبی، تہذیبی، لسانی، معاشرتی اور تاریخی قدروں اور روایتوں کی پامالی کو اگر وبائی امراض کی طرح عام و متعدی بنا دینے کی مکروہ تدبیریں ہیں تو اس کے لیے قوم اور قوم کے لیے فکر مند ذہنوں کو ایک اجتماعی اعتکاف کے لیے یکسو ہونے کی ضرورت کا احساس ہونا ہی چاہیے۔

***

قریب سو سال پہلے جب ملک کی دو قوموں میں اختلافات کا دور شروع ہو چکا تھا اور نزاعات کے لیے نئی نئی وجہوں کی تلاش میں حکومت اور اس کی سرپرستی میں کچھ خاص طبقوں کی دلچسپی بڑھنے لگی تھی۔ اس وقت یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ دونوں قوموں میں اختلافات کی جو آگ بھڑک رہی ہوئی ہے اس کو ہوا ان دو عمارتوں کے کھلے دریچوں سے مل رہی ہے جن میں سے ہر ایک پر انگریزی کا حرف (C) لکھا ہوا ہے یعنی کورٹ اور کالج۔ ان دونوں کے 'کافوں' نے اس وقت ملک کو جس کوفت میں مبتلا کرنا شروع کیا تھا وہ اب غالب کی زبان میں کاوِ کاوِ زندگانی کی کامل کہانی بن چکی ہے۔ جس کی ایک مثال مہاراشٹر اور ملک میں اورنگ زیب کے نام سے نفرت کی موجودہ لہر

ہے۔ فرضی قصہ پر مبنی ایک فلم نے اورنگ زیب کے نام سے ایک قوم کی دشمنی میں مغرور و جابرانہ فکر و ذہن کو ہر حد سے گزر جانے کا موقع فراہم کر دیا اور اب بات یہاں تک آپہنچی کہ اورنگ زیب کی قبر کا نشان بھی مٹا دینے کی تیاری ہے۔ بستیوں کے نام بدلنے سے جی نہیں بھرا تو تاریخ کے نشان بھی نشانے پر آ گئے۔ ذرا قریب سے اور غور سے دیکھا جائے تو اس عمل میں کورٹ اور کالج یعنی عدلیہ اور تعلیم دونوں کا برابر کا حصہ ہے۔ تعلیم میں اصل تاریخ کی جگہ مفروضہ اور اساطیری کہانیوں کو شامل کرنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ دو قوموں میں نزاعات و اختلافات کو ہوا دی جائے اور ہوا دینے والوں کو پناہ، اسی تعلیم سے ملوث عدلیہ کے ذریعہ حاصل ہو۔ سالار مسعود غازی حملہ آور تھے، عالم گیر ہندو کش تھے، یہ ظاہر کرنے کے لیے کتابوں اور فلموں کے خریدار اور تماشائی ہاتھ ضرور آتے ہیں لیکن خود غرضی اور خود مفادی کے نشہ میں چور یہ استحصالی طبقہ بھول جاتا ہے کہ عارضی کامیابی میں ملک کی دائمی ناکامی بھی چھپی ہے۔ ٹھیک سو سال پہلے تلک مہاراج نے مہاراشٹر کے پس منظر میں بقول معارف سواجی اور عالمگیر کی ہڈیوں کو اکھاڑنا شروع کیا تھا، انگریزوں کی مدد سے شیوا جی کو قومی ہیرو بنانے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے مقابل میں عالمگیر کو ہر ظلم اور برائی کا سرچشمہ ٹھہرایا جائے۔ تاریخ سازی کی گئی اور جعلی تحریریں بنانے کے کارخانے قائم کیے گئے۔ نتیجہ سامنے تھا اور اب تو یہ اپنے عروج پر ہے جس کے زوال کی فی الحال امید بھی نہیں۔

***

اس حقیقت کو کیسے سمجھا اور سمجھایا جائے کہ ہندوستان کی دو قوموں میں نفاق ڈالنے کی ابتدا تو تیسری اور اجنبی قوم کی جانب سے ہوئی تھی مگر بہت جلد دوسری قوم نے اس کام کو اپنا لیا۔ ہماری قوم کے نمائندہ ذہنوں کو اسی وقت اجتماعی اعتکاف کی ضرورت کو سمجھ لینا تھا۔ اور خود کے علاوہ دوسری قوم کے ان ذہنوں کو بھی دیکھنا تھا جو واقعی دونوں قوموں کے اتحاد کے خواہاں تھے۔ ایسے لوگ پہلے بھی کم تھے اور اب تو یہ بس شاذ ہی ہیں۔ لیکن جو ہیں وہ اپنی فطری صلاحیت کی پکار کی وجہ سے ہیں۔ ابھی ایک مضمون نظر سے گزرا۔ نفس مضمون نیا نہیں، دار المصنّفین نے تاریخ کی سچائیوں کو مدافعانہ سے زیادہ مخلصانہ اور غیر جانب دار عالمانہ شان سے بیان کرنے کی مسلسل کوشش کی لیکن مذکورہ مضمون، معروف مورخ ہربنس مکھیا کے ایک مضمون کے خلاصہ کی شکل میں سامنے آیا تو لگا کہ ہوا کا یہ ایسا تازہ جھونکا ہے جس میں اگر سانس لی جائے تو کئی امراض کا ازالہ و مداوا ہو سکتا ہے۔ ان کی باتوں میں وہ یقین اور ادعائیت بھی ہے جو جھوٹ کی قلعی اتار سکے۔ انھوں نے لکھا کہ تاریخ

کی کتابوں میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ ایک سلطان نے اتنے مسلمان بنائے۔ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان بنانے کا ذکر تو کسی تاریخ میں نہیں۔ ہندوؤں کی ہندی زبان میں لکھی تاریخوں میں بھی کہیں یہ ذکر نہیں ہے کہ فلاں بادشاہ نے لوگوں کا مذہب زبردستی تبدیل کرایا۔ ہمارے ماخذ بالکل خاموش ہیں، کوئی تحقیقی مواد نہیں جس سے معلوم ہو کہ ہندوستان میں لوگ مسلمان کس طرح بنے۔ برسوں پہلے یہ فسانہ عام ہوا تھا کہ عہد وسطیٰ میں تین سو مندروں کو توڑا گیا تھا پھر ایک آدھ سال میں تین سو سے تین ہزار ہو گئے پھر دو سال میں یہ تیس ہزار اور اس کے بعد ساٹھ ہزار کر دیے گئے۔ ہربنس مکھیا نے اس طرح کی تاریخ سازی کے نام پر جعل سازی پر دکھ ظاہر کیا اور تائید میں ایک برطانوی امریکی مورخ رچرڈ ایٹن کے ایک مضمون کے حوالے سے لکھا کہ ۱۰۰۰ء سے ۱۷۶۰ء تک سات سو ساٹھ سالوں میں صرف اسّی (۸۰) مندروں کی نشان دہی کی جا سکی کہ وہ غالباً مسمار کیے گئے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آٹھ سو سالوں میں صرف اسّی (۸۰) مندروں کو توڑ کر اکثریت کو اپنا مذہب بدلنے کے لیے قائل کیا جا سکا۔ صوفیہ کے ذریعہ مسلمان بنانے کی تاریخی شہادتیں بھی موجود نہیں ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ زیادہ تر صوفیہ نے مسلم اکثریت والے علاقوں ہی کا رخ کیا۔ مکھیا کا کہنا ہے کہ اگر غیر مسلموں کو اسلام میں لانا ہی ہوتا تو ظاہر ہے کہ ان علاقوں کا رخ کیا جاتا جہاں مسلمان کم تھے۔ انہوں نے یہ عجیب مگر طاقتور دعویٰ بھی کیا کہ پچاس فی صد کی تعداد میں لوگ مسلمان اس وقت ہوئے جب انگریزوں کی حکومت تھی۔ مکھیا نے تاریخی نقطۂ نظر سے یہ دلچسپ سوال کیا کہ پانچ چھ سو سالوں میں اسلامی حکومت کا فرض تھا کہ وہ یا تو سبھی کو مسلمان بنا دیتے یا پھر ختم کر دیتے۔ اگر پندرہ سولہ فیصد لوگ مسلمان ہوئے تو پھر یہ اسلامی حکومت کا کیسا ادائے فرض تھا؟ سب سے زیادہ مسلمانوں کی اکثریت کشمیر، کیرلا، سندھ اور مشرقی بنگال میں رہی اور ان ہی علاقوں میں اسلامی حکومت بھی سب سے کمزور رہی۔ شمالی ہند جہاں یہ حکومت سب سے مضبوط تھی وہاں مسلمانوں کی تعداد کبھی اٹھارہ انیس فیصد سے زیادہ نہیں رہی۔ ہربنس مکھیا جیسی آوازیں اب ملک میں مدھم ضرور ہیں لیکن معدوم نہیں۔ ایسے ذہنوں کی قدر یہی ہے کہ ہمارے نمائندہ ذہن شکوہ شکایت سے زیادہ تاریخی حقائق کو پیش کرنے میں ہمت و جرأت سے کام لیں۔ جارحانہ نہیں تو مدافعانہ رویہ بھی نہیں۔ وصل اور فصل اور ان کی حکایاتِ مہر و وفا کی افادیت اپنی جگہ۔

***

مقالات

مطلب الطالبین فی تفسیر کلام رب العالمین: ایک جائزہ

ڈاکٹر غازی نذیر نقاش

اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنولوجی، اونتی پورہ، جموں وکشمیر

ghazinazir7@gmail.com

وادی کشمیر کی علمی تاریخ میں شیخ یعقوب صرفی رحمہ اللہ کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ آپ بلند پایہ مفسر، محدث اور فقیہ ہونے کے علاوہ ایک بیدار مغز سیاسی رہنما بھی تھے۔ کشمیر کی علمی اور ملی تاریخ پر آپ کے گہرے نقوش آج تک موجود ہیں۔ آپ کی گراں قدر علمی خدمات میں آپ کی تفسیر مطلب الطالبین فی تفسیر کلام رب العالمین سر فہرست ہے۔ یہ تفسیر اگرچہ نامکمل اور تاحال مخطوط کی صورت میں موجود ہے مگر اس کا مطالعہ آپ کے تبحر علمی کا ایک اہم ثبوت ہے۔ راقم کے علم کے مطابق اس تفسیر کا صرف ایک ہی مخطوطہ موجود ہے جو کہ حکومت جموں وکشمیر کے ڈپارٹمنٹ آف لائبریریز اینڈ ریسرچ سے منسلک ایس۔پی۔ایس لائبریری واقع مولانا آزاد روڈ، سرینگر کے شعبہ مخطوطات میں ایکسیشن نمبر ۴ کے تحت محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۹۲ فولیوز / ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اگرچہ مخطوطہ کافی ابتر حالت میں ہے اور اسے پڑھنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے مگر مذکورہ ڈپارٹمنٹ نے ڈیجٹائزیشن کے ذریعے اس کی حفاظت اور تحقیق کے امکانات میں کافی حد تک اضافہ کیا ہے۔

تعارف: یہ تفسیر اگرچہ فقط سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی ابتدائی ۶۲ آیات کی تفسیر پر مشتمل ہے مگر اپنے حجم، دقیق علمی مباحث اور علوم شریعہ کی امہات الکتب سے استفادے کی بنا پر یہ تفسیر بلا مبالغہ کشمیر کی علمی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

وجہ تصنیف: اس تفسیر کی وجہ تصنیف کا تذکرہ کرتے ہوئے شیخ یعقوب صرفی رحمہ اللہ تفسیر کے مقدمے میں رقمطراز ہیں:

سألني بعض من الاحباء أن أشرح لأيات القرآن المجيد وأفسر سور الفرقان الحميد شرحاً

وتفسيراً يكشف عن وجوه المعاني أستارها[1]

(مجھ سے کچھ عزیزوں نے اس بات کا تقاضا کیا کہ میں قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کی ایسی واضح تفسیر بیان کروں کہ معنی کی تفہیم میں کوئی پردہ حائل نہ رہے)۔

حبا على الإقبال على حصول مسألتهم، جدت قريحتى بصر البليات وخمدت طبيعتى تعرض النكبات، وساء حالى وتفرق بالى بحوادث الأعصار والأزمان، وتباعد البلدان وبنوا الأوطان عنى حين أحرر صفحاً منه بالكشمير وصفحاً آخر بالهند[2]

(انکے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے میں نے اپنی طبیعت کو (زمان و مکان کی) آزمائشوں، میری ذات پر زمانے کے حادثات کے اثرات اور وطن اور اہل وطن سے اس قدر دوری کہ میں ایک صفحہ کشمیر میں اور دوسرا صفحہ ہندوستان میں لکھ رہا ہوں، کو نظر انداز کرنے پر آمادہ کرلیا)۔

منہج تفسیر: یہ تفسیر،تفسیر بالرائے المحمود کی ایک عمدہ مثال ہے۔ آیات کی تفسیر کے لئے قرآن، حدیث، اقوال صحابہ و تابعین کے علاوہ لغت، علم کلام اور علم سلوک سے استفادہ کیا گیا ہے۔ امام رازی، امام قرطبی، امام سیوطی، امام بیضاوی اور جار اللہ زمخشری جیسے مفسرین کے علاوہ امام ابن صلاح، امام غزالی، امام جرجانی، امام راغب اصفہانی، علامہ تفتازانی وغیرہم جیسے ائمہ فنون کی کتابوں سے نہ صرف استفادہ کیا گیا ہے بلکہ متعدد مقامات پر اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مفسر نے جابجا دقیق نحوی اور صرفی مباحث پر کافی و شافی کلام کیا ہے۔ اس کے علاوہ مفسر نے دقیق فقہی اور کلامی مباحث پر بھی کلام کیا ہے۔

کتابیات: شیخ یعقوب صرفی رحمہ اللہ کے تبحر علمی کا اندازہ اس تفسیر کے مآخذ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس تفسیر کا قرآن مقدس کی فقط چند ہی آیات پر مشتمل ہونے کے باوجود مصنف نے مختلف شرعی علوم سے تعلق رکھنے والی دو درجن سے زائد کتابوں سے حوالہ جات پیش کئے ہیں۔ اس تفسیر میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

کتب تفسیر

- مفاتیح الغیب از امام فخر الدین رازی

---

[1] شیخ یعقوب صرفی، مطلب الطالبین فی تفسیر کلام رب العالمن، مخطوط، ص ۱

[2] ماخذ سابق

- تفسیر الکشاف از جار اللہ زمخشری
- انوار التنزیل واسرار التاویل (تفسیر بیضاوی) از ناصر الدین عبد اللہ بن عمر البیضاوی
- الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی) از ابو عبد اللہ محمد بن ابو بکر الانصاری
- الدر المنثور از جلال الدین السیوطی

کتب حدیث

- صحیح بخاری
- صحیح مسلم
- موطا مالک
- سنن ترمذی
- مسند احمد
- سنن بیہقی
- مشکاۃ المصابیح
- مسند الفردوس
- معجم الطبرانی
- فتح الباری

عربی لغات

- الصحاح از ابو نصر اسماعیل بن حماد الجوہری
- مفردات القرآن از راغب اصفہانی
- النھایۃ فی غریب الحدیث والاثر از ابن اثیر
- فقہ اللغۃ از ابن الفارس
- شرح المفتاح از علامہ شیرازی
- المطول از سعد الدین تفتازانی
- القاموس المحیط از فیروز آبادی

ان اہم کتابوں کے علاوہ شیخ یعقوب صرفی نے اخفش، سیبویہ، خلیل اور مازنی جیسے مشہور لغوی علماء کی علمی آراء سے بھی استفادہ کیا ہے۔

- فقہ و اصول فقہ
- الام از امام شافعی
- التلویح علی التوضیح علامہ تفتازانی

علم الکلام

- نھایۃ الاقدام فی علم الکلام از محمد بن عبد الکریم شہرستانی
- فصوص الحکم از محی الدین ابن عربی
- المقصد الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی از امام غزالی

ان کتابوں کے علاوہ مفسر نے علامہ طیبی، ابو شامہ مقدسی، ابو نصر فارابی، ابن الحاجب، ابو منصور ماتریدی، آمدی، ابن عساکر اور ابن سینا کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

مطلب الطالبین میں علوم القرآن کے مباحث

ایک مفسر قرآن کے لئے علوم القرآن سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس تفسیر میں علم قرأت کے علاوہ علوم القرآن کے دیگر مباحث مثل ناسخ و منسوخ، اسباب نزول، اعجاز القرآن اور امثال القرآن پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے۔ اگر چہ مطلب الطالبین ایک نامکمل تفسیر ہے مگر اس میں علوم القرآن سے متعلق جتنے بھی مباحث ہیں وہ اس فن میں مفسر کی مہارت کا ایک واضح ثبوت ہے۔

اس تفسیر میں متذکرہ بالا علمی مباحث کے علاوہ علوم القرآن کے مندرجہ ذیل مباحث پر بھی سیر حاصل کلام کیا گیا ہے:

(۱) سورتوں کے ناموں پر تفصیلی مباحث، مفسر رحمہ اللہ نے سورہ فاتحہ کے تقریباً بارہ ناموں پر تفصیلی کلام کیا ہے۔

(۲) اسباب النزول کے موضوع پر کلام کرتے ہوئے مفسر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

ذکر ابن الصلاح وغیرہ من اهل الحدیث ان الصحابی اذا ذکر ما یتوقف علی السماع کبیان سبب النزول ونحوہ کان مرفوعاً [۳]

(ابن صلاح اور دیگر محدثین نے یہ بات بیان کی ہے کہ اگر صحابی کسی ایسی بات کا تذکرہ کرے جس کا دارومدار مجرد سماع پر ہو جیسا کہ سبب نزول کا بیان کرنا وغیرہ تو ایسی روایت حکماً مرفوع ہوگی)۔

(۳) اسی طرح شیخ یعقوب صرفی رحمہ اللہ نے علم قرأت پر بھی مفصل کلام کیا ہے، سورہ فاتحہ کی تیسری آیت پر کلام کرتے ہوئے آپ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ثم اعلم ان عاصم و الکسائی و یعقوب قرأو مالك یوم الدین بصیغة اسم الفاعل [۴]

(پھر یہ بات جان لو کہ عاصم، کسائی اور یعقوب نے **مالك یوم الدین** کو صیغہ فاعل کے ساتھ ادا کیا ہے)۔

اسی طرح الصراط کی مختلف قرأت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

وقرأ ابن کثیر بروایة قنبل و رویس عن یعقوب بالأصل أی السراط بالسین و حمزة والخلف والخلاد بالإشمام والباقون بالصاد وھی لغة قریش۔ [۵]

(اور (عبداللہ) ابن کثیر نے قنبل سے اور رویس نے یعقوب سے (اس لفظ) اصل یعنی س کے ساتھ روایت کیا ہے جبکہ حمزہ، خلف اور خلاد نے اِشمام کے ساتھ اور بقیہ (قراء) نے ص کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہی قریش کا لہجہ ہے)۔

(۴) شیخ یعقوب صرفی رحمہ اللہ نے اعجاز قرآن کے موضوع پر بھی کلام کیا ہے۔ اس باب میں آپ نے خصوصاً قرآن مقدس کے لغوی اعجاز پر سیر حاصل کلام کیا ہے۔ اس موضوع پر لکھتے ہوئے آپ نے عبدالقاہر جرجانی کی کتاب دلائل الاعجاز سے متعدد حوالہ جات پیش کیے ہیں۔

(۵) سورہ بقرہ کی آیات ۱۷۔۲۰ پر کلام کرتے ہوئے امثال القرآن کے موضوع پر بھی آپ نے مفصل کلام کیا ہے۔ اس باب میں تفسیر کشاف اور تفسیر بیضاوی سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

---

[۳] ماخذ سابق، ص۱۹

[۴] ماخذ سابق، ص۳۷

[۵] ماخذ سابق، ص۴۶

مطلب الطالبین میں علم حدیث کے مباحث: علم حدیث شیخ یعقوب صرفی رحمہ اللہ کا اصل علمی میدان ہے۔ آپ رحمہ اللہ مشہور محدث ابن حجر مکی رحمہ اللہ کے شاگرد اور اجازت یافتہ ہیں۔ آپ نے اس تفسیر میں اپنے جلیل قدر استاد کا تذکرہ متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ایک مقام پر رقمطراز ہیں:

وأجاب شيخى و استاذى خلف المتقدمين وقدوة المتاخرين شهاب الدين احمد المعروف بابن الحجر قدس سره فى كتابه المسمى بالدر المقصود[۶]

(ہمارے شیخ و مرشد، یادگار اسلاف اور اسوہ متاخرین شہاب الدین احمد المعروف بہ ابن حجر قدس سرہ نے اپنی کتاب الدر المقصود میں بیان کیا ہے۔۔۔)

علم حدیث سے شیخ یعقوب صرفی رحمہ اللہ کے شغف کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مقدس کے ایک قلیل حصے کی تفسیر ہونے کے باوجود اس تفسیر میں بلا مبالغہ سینکڑوں احادیث سے استدلال کیا گیا ہے۔ احادیث کا حوالہ دینے کے علاوہ مفسر رحمہ اللہ نے صحت حدیث اور رواۃ حدیث کی جرح و تعدیل کے حوالے سے بھی کلام کیا ہے۔ راوی حدیث علا بن عبد الرحمٰن کے متعلق فرماتے ہیں:

مدار هذا الحديث على العلا بن عبد الرحمن بن يعقوب وقد ضعّفه يحيى بن معين وتكلم فيه هو وغيره[۷]

(اس حدیث کا دارومدار علا بن عبد الرحمٰن بن یعقوب پر ہے جس کو یحیی بن معین نے ضعیف راوی قرار دیا ہے اور انہوں نے اور دیگر محدثین نے اس پر کلام کیا ہے)۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

ابن ابي مليكة ليس بمدلس[۸] (ابن ابی ملیکہ مدلس نہیں ہے)۔

اسی طرح شیخ رحمہ اللہ نے متعدد مقامات پر بظاہر متعارض احادیث میں ترجیح یا تطبیق کے ذریعے تعارض رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ رفع تعارض پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[۶] ماخذ سابق، ص ۴۷

[۷] ماخذ سابق، ص ۲۰

[۸] ماخذ سابق

ان الروايتين عن ابي هريرة تعارضتا وان الترجيح معناً لأن رواية الإثبات مقدمة على رواية النفي[۹]

(ابوہریرہؓ سے مروی ان دو روایات میں تعارض پایا جاتا ہے، ترجیح ہمارے حق میں ہے کیونکہ (اصولاً) روایات اثبات کو روایات نفی پر ترجیح حاصل ہے)۔

فضائل سے متعلق روایات پر اصولی کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هذا حديث صحيح وان كان اكثر الحديث المروية عن ابي بن كعب في فضائل السور موضوعةوزاد الصغاني: وضعه رجل من أهل عبادان، وقال: لما رأيت الناس اشتغلوا بالأشعار وفقه أبي حنيفة رحمه الله وغير ذلك ونبذوا القرآن وراء ظهورهم، أردت أن أضع لكل سورة فضيلة أرغب الناس بها في قراءة القرآن وقل تفسير خلا من ذكر هذه الفضائل إلا من عصمه الله تعالى، والله أعلم بتحقيقه[۱۰]

(یہ حدیث صحیح ہے، اگرچہ اکثر احادیث جو اُبَی بن کعب سے سورتوں کے فضائل کے متعلق روایت کی گئی ہیں، وہ موضوع ہیں اور صغانی فرماتے ہیں: یہ عبادان کے رہنے والے ایک شخص نے وضع کی تھی، جسکا (اپنے دفاع) کہنا تھا کہ جب میں نے دیکھا کہ لوگ اشعار، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی فقہ اور دیگر چیزوں میں مشغول ہو گئے ہیں اور قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے، تو میں نے ہر سورہ کے لیے ایک فضیلت وضع کرنے کا ارادہ کیا تاکہ لوگوں کو قرآن کی تلاوت کی طرف رغبت دلاؤں۔ بہت کم تفاسیر ہیں جو ان فضائل کا ذکر کرنے سے خالی ہیں، سوائے ان کے جن کی اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی، اور اللہ بہتر جانتا ہے)۔

حدیث کے صحت و سقم کے حوالے سے شیخ رحمہ اللہ کا عالمانہ کلام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ عام خیال کے برعکس برصغیر میں مدرسہ شاہ ولی اللہ سے پہلے بھی علوم حدیث کے ماہرین موجود تھے۔

مطلب الطالبین میں کلامی مباحث: شیخ یعقوب صرفی رحمہ اللہ کے تبحر علمی اور تفسیر مطلب الطالبین کا علمی مقام اس تفسیر میں جا بجا بیان کئے گئے کلامی مباحث سے بھی واضح ہوتا ہے۔ اس باب میں امام رازی، امام غزالی، شہرستانی اور ابن عربی جیسے جہابذہ کی علمی آراء سے استفادہ کیا گیا ہے۔ فہم قرآن

---

[۹] ماخذ سابق، ص ۲۵

[۱۰] ماخذ سابق، ص ۵۴

میں نقلی علوم کے ساتھ ساتھ عقلی علوم میں مہارت کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اعلم ان في هذه السورة نكات شريفة لا يطلع عليها الا من هو بارع في العلوم العقلية والنقلية[11]

(خوب جان لو کہ اس سورہ میں ایسے دقیق علمی نکات ہیں جن پر صرف وہی شخص مطلع ہو سکتا ہے جو عقلی اور نقلی علوم میں ماہر ہو)۔

علم عقائد کے اہم مضامین جیسے توحید الأسماء والصفات، قدر، خلق افعال العباد وغیرہ میں، شیخ یعقوب صرفی رحمہ اللہ نے اہل سنت کے عقیدے کا دفاع کرنے کے علاوہ معتزلہ کے عقائد کا علمی تعاقب بھی کیا ہے۔ عقدی مباحث میں آپ رحمہ اللہ نے اہل سنت کے کلامی مذاہب میں سے، اشعری مکتبِ فکر کو اپنایا ہے۔

توحید اسماء وصفات کی تفہیم و تشریح کے حوالے سے آپ رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

ثم لا يخفى أن كلام الله تعالىٰ من أمهات صفاته سبحانه أى صفاته الثبوتية السبعة وهى الحيوة والعلم والارادة والقدرة والسمع والبصر والكلام۔[12]

(یہ (بات اہل علم سے) پوشیدہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس کی بنیادی صفات میں سے ہے، یعنی اس کی سات ثبوتی صفات میں سے ہے جو یہ ہیں: حیات، علم، ارادہ، قدرت، سمع، بصر، اور کلام)۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

ومذهب السلف في المتشابهات ترك الاشتغال بتاويل وأن نؤمن بأن المتشابه صدق وحق ولا شك في كونه كلام الله وبأن ما أراده الله منه حق وعقلنا عاجز عن إدراك مراد الله منه وأما المتأخرون فذهبوا إلى تجويز الاشتغال بتاويل فيه[13]

(سلف کا متشابہات کے بارے میں یہ مذہب ہے کہ ان کی تاویل سے کنارہ کشی کی جائے اور یہ کہ ہم ایمان رکھیں کہ متشابہ حق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور جو اس

---

[11] ماخذ سابق، ص ۱۴

[12] ماخذ سابق، ص ۹۲

[13] ماخذ سابق، ص ۱۴۰

(متشابہات) سے اللہ نے چاہا ہے وہ حق ہے اور ہماری عقل اللہ کے ارادے کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اور جہاں تک متاخرین کا تعلق ہے تو انہوں نے اس کی تاویل کی کوشش کرنے کی اجازت دی ہے)۔

اسی طرح مسئلہ قدر کے بارے میں اہلسنت کے موقف کی نمائندگی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقوله إياك نعبد و إياك نستعين يدل على نفي القدر والجبر وعلى إثبات أن الكل بقضاء الله تعالیٰ[۱۴]

(اور اللہ تعالیٰ کا فرمان إياك نعبد و إياك نستعين قدریہ اور جبریہ کے (عقیدے) انکار پر دلالت کرتا ہے اور اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے)۔

ایک اور مقام پر معتزلہ کے مذہب کارد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ولا يخفى أن الطغيان أضيف إليهم لأنه من مكتسباتهم و إن كان مخلوقاً لله تعالیٰ كما هو مذهب أهل السنة من أن فعل العبد كسب العبد وخلق الله تعالیٰ فلا وجه لتوجيه المعتزلة في هذه الآية نصرة لمذهبهم[۱۵]

(اور یہ بات مخفی نہیں کہ طغیان (سرکشی) ان کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ ان کے اعمال میں سے ہے، اگرچہ یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ جیسا کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ بندے کا فعل بندے کا کسب اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اس لیے اس آیت کی معتزلہ کی طرف سے اپنے مذہب کی حمایت کے لیے جو توجیہ کی جاتی ہے، اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے)۔

مندرجہ بالا مباحث پر شیخ یعقوب صرفی رحمہ اللہ کا تفصیلی کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ رحمہ اللہ نہ صرف علوم شریعہ کے غواص تھے بلکہ ان مختلف علوم کے ماہر تھے۔ یہ بات افسوسناک ہے کہ یہ گراں قدر علمی سرمایہ آج تک اہل علم کی توجہ حاصل نہ کر سکا۔ تلاش بسیار کے باوجود اس تفسیر کا کوئی دوسرا مخطوطہ دستیاب نہ ہو سکا۔ آج جب کہ قدیم مخطوطات پر تحقیق اور علمی سرمایے کی حفاظت پر ہر طرف محنت ہو رہی ہے ہمیں بھی اپنے اسلاف کی علمی تراث کی حفاظت اور ان کی تحقیق وطباعت کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔

---

[۱۴] ماخذ سابق، ص ۱۶

[۱۵] ماخذ سابق، ص ۱۰۷

مشائخ دہلی کی فقہی خدمات کا ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد ممتاز عالم

اسسٹنٹ پروفیسر، مولانا مظہرالحق عربی وفارسی یونیورسٹی، پٹنہ

mumtaz.alam48@gmail.com

علوم اسلامی میں ''فقہ'' کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ فن قرآن وحدیث، اجماع اور قیاس سے ماخوذ ہے اور مسلمانوں کے امور شریعت کی ادائیگی میں انتہائی معاون ہے۔ اس کی ضرورت زندگی کے ہر موڑ پر رہی ہے اس لئے مسلمان جہاں جہاں گئے یہ فن بھی ان کے ساتھ ساتھ گیا۔ بلا تفریق رنگ ونسل اور ملک وقوم، ہر فرد مسلم اس کا محتاج رہا ہے۔ اسی کے پیش نظر مسلم معاشرے میں اس علم کے حصول کا شوق اور ماہرین کی قدر ومنزلت شروع ہی سے رہی ہے۔

ہندوستان ان خوش نصیب ملکوں میں سے ایک ہے جہاں نہ صرف مسلمان آئے بلکہ یہاں ایک طویل عرصہ تک حکمرانی کرتے رہے۔ انہیں اس علم کے سہارے جہاں مسلمانوں کے معاملات کی رہنمائی میں مدد ملی وہیں وہ غیر مسلم آبادی کو بھی ان کے حقوق خوش اسلوبی سے ادا کرنے اور اس ملک کی تہذیب کی بقا کا سامان فراہم کرنے کے قابل ہو سکے۔

اس ملک میں فقہِ اسلامی کا داخلہ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی ہو گیا۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے: ''برصغیر پاک وہند میں فقہی مسائل کا آغاز اسی وقت سے ہو گیا جب محمد بن قاسم اور اس کے رفقا کے بابرکت قدم اس سرزمین پر پہنچے''[1]۔

ابتدا میں یہاں بڑے مدارس یا دار الافتاء نہیں تھے۔ وہ جگہ جہاں سے اسلامی علوم کی اشاعت کا کام ہوتا تھا اس میں سب سے اہم جگہ مسجد تھی جو جہاں عبادت گاہ تھی وہیں اس کی دوسری حیثیت درسگاہ کی بھی تھی جس کی شہادت سے تاریخی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

لوگ دینی مسائل کی رہنمائی ان مساجد میں مقرر امام یا خطیب سے حاصل کرتے تھے۔ عوامی سطح

---

[1] آب کوثر، ص ۱۲۵، شیخ محمد اکرام، فرید بکڈپو دہلی، ب۔ت۔

پر نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ اور دیگر معلومات یہیں سے حاصل کی جاتی تھیں۔ قیام سلطنت کے بعد بڑے بڑے مدارس قائم ہوگئے اور خود شاہی دربار میں فقیہ کی اہمیت دوچند ہوگئی۔ مذہبی امور کا رہنما انہیں میں سے منتخب کیا جانے لگا۔ الغرض عوام وخواص دینی معاملات میں کسی نہ کسی طرح فقہا کی رہنمائی کے حاجت مند تھے۔ بزرگ بن شہریار نے یہاں کے ذوق استفتا کے سلسلے میں بتایا ہے کہ نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی احکام شرع کی معرفت حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے تھے۔ اس نے لکھا:

میں ۲۸۸ھ میں منصورہ میں تھا۔ وہاں مجھ سے مستند بزرگوں نے بیان کیا کہ "الرا" کے راجہ نے، جو ہندوستان کا بڑا راجہ تھا اور جس کی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیریں کے بیچ میں تھی اور جس کا نام مہروک بن رانو تھا، ۲۷۰ھ میں منصورہ کے بادشاہ کو لکھا کہ وہ اسلام کی شریعت کا کچھ حال زبان ہندیہ میں اس کو بتائے۔[۲]

اس سرزمین پر فقہ اسلامی کی بڑی مقبولیت رہی ہے بالخصوص شروع ہی سے یہاں فقہ حنفی متعارف اور مروج رہی ہے۔ یہاں جن علاقوں سے علمی شخصیتوں اور مبلغین اسلام کی آمد ہوئی وہ سب فقہ حنفی کے پیرو تھے اور وہاں فقہ حنفی ہی مقبول تھی اس لئے ان کے اثرات کی وجہ سے فقہ حنفی کو فروغ ہوا۔

عالم اسلام کے مشرقی علاقوں میں فقہ حنفی کا غلبہ رہا ہے اور فقہ شافعی کے پیرو کم رہے ہیں۔ چونکہ ہندوستان اس کے جوار میں واقع ہے اس لئے اس کے اثرات کی وجہ سے اس علاقے پر بھی فقہ حنفی کا غلبہ رہا ہے۔ آج بھی یہی صورت حال ہے کہ کیرالا کے ساحلی علاقے پر فقہ شافعی کے مقلد بستے ہیں مگر ہندوستان کے دوسرے خطوں میں اس کے پیرو نہیں پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان کے جن شہروں کو قدیم زمانے سے علمی، سیاسی، تہذیبی اور مختلف جہتوں سے مختلف ادوار میں شرف مرکزیت حاصل ہوتا رہا ہے دہلی ان میں سرفہرست ہے۔ جس زمانے میں دہلی کو مسلمانوں نے پایۂ سلطنت بنایا اس وقت اس کی علمی شوکت قابل دید تھی۔ ایک ہزار مدرسے صرف شہر دہلی میں تھے۔ بعض کی کفیل حکومت تھی اور بعض امرا کے ماتحت تھے اور بعض قابل علما کی وجہ

---

[۲] عجائب الہند بحوالہ ہندوستان عربوں کی نظر میں، ص ۴/۱۹۳ اعظم گڈھ ۱۹۶۰ء۔

سے چلتے تھے۔ اس وقت علم کے پروانوں کی پہلی پسند عالم میں انتخاب دہلی تھی۔

دہلی کو مرکزی حیثیت غلام خاندان کے دور میں حاصل ہوئی اور اسی زمانے میں اصحاب علوم وفنون کا قافلہ دہلی میں اترنے لگا۔ چنگیزی ظلم وستم سے تنگ آکر جہاں دوسرے فنون کے ماہرین نے دہلی کا رخ کیا وہیں فقہائے اسلام کا قافلہ بھی دہلی میں خیمہ زن ہوا۔ اس زمانے میں محمد بن قاسم کے عہد کی طرح پھر یہ بحث شباب پر آگئی کہ یہاں کے ہندو "اہل کتاب" ہیں یا نہیں؟ بحث کی یہ مجلس شمس الدین التمش کے دربار میں منعقد ہوئی اور علما نے مشورہ دیا کہ "ہندوؤں سے صرف جزیہ یا خراج لینے پر اکتفانہ کیا جائے بلکہ اسلام یا قتل دونوں میں سے کوئی ایک حکم اختیار کیا جائے" مگر اس رائے کو قبول نہیں کیا گیا۔

التمش کے زمانے میں بے شمار علما و فضلا دہلی میں جمع ہو گئے۔ فقہی خصوصیات کے لئے مشہور ناموں میں قاضی فخر الائمہ شیخ حمید الدین ناگوری، قاضی قطب الدین کاشانی، قاضی نجم الدین صغریٰ کے اسما مشہور ہیں۔ شیخ اسحٰق بن علی بخاری دہلوی کا شمار بھی دہلی واطراف دہلی کے نامور فقہا میں ہوتا تھا۔ مولانا شرف الدین ولوالجی دہلوی بلبن کے عہد کے مشہور فقیہ ہیں۔ قاضی وجیہ الدین کاشانی ایبک کے عہد حکومت میں ہندوستان کے قاضی القضاۃ تھے۔

اس مقالے میں مشائخ کی فقہی خدمات زیر بحث ہیں اس لئے انہیں علما کا تذکرہ کیا جائے گا جن کے سر پر طریقت کا تاج ہو یا کسی سلسلے میں داخل بیعت اور اس کے خلیفہ مجاز ہوں۔ علما کے احوال طریقت کی آشنائی کی راہ شیخ عبد الحق نے "اخبار الاخیار" لکھ کر آسان کر دی ہے۔

علمی دنیا میں عمومی طور پر انہیں ہی حیات جاوداں مل پاتی ہے جنہوں نے تصنیف و تالیف کا کام کیا ہو۔ اگر تحریر یادگار نہیں ہے تو پھر ایک محقق کے لئے بڑا مشکل کام ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں کچھ کہے یا لکھے۔ لیکن اس فن کے ماہرین، مشہور زمانہ اساتذہ اور اس کی اشاعت میں شریک شخصیات بھی قابل ذکر ہوتی ہیں۔ اگر اس حیثیت سے دیکھا جائے تو مشائخ دہلی فقہ اسلامی کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ ان میں کچھ اہم شخصیات مندرجہ ذیل ہیں:

شیخ قاضی منہاج الدین سراج جرجانی (۶۴۳ھ-۱۲۷ھ): قاضی منہاج کے اجداد جرجان کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا نے غزنی میں اقامت اختیار کی پھر لاہور آئے۔ قیام لاہور کے

درمیان وہاں کے قاضی کا عہدہ ان کے ہی خاندان میں تھا۔ قاضی منہاج کی ولادت فیروزکوہ میں ہوئی۔ علم وفن میں کمال کو پہنچے۔ ناصر الدین قباچہ کے دور میں مدرسہ فیروز شاہی کے معلم مقرر ہوئے۔ یہ اس زمانے میں دہلی کے ایک ہزار مدرسوں میں سب سے بڑا مدرسہ تھا۔ جب التمش نے قباچہ کو شکست دے کر اچہ اور ملتان پر قبضہ کر لیا تو منہاج دہلی آ گئے۔ فتح گوالیار کے بعد وہاں کے قاضی مقرر ہوئے۔ بہرام شاہ نے اپنے دور حکومت میں انہیں شہر دہلی کا قاضی اور صدر الصدور مقرر کیا۔ بہرام شاہ کی معزولی کے بعد وہ بھی اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر لکھنوتی میں اقامت پذیر ہو گئے۔ پھر دہلی واپس آئے تو انہیں مدرسہ ناصریہ کا مہتمم اور جامع مسجد کا خطیب مقرر کیا گیا۔ ناصر الدین محمد اور بلبن کی قدر شناسی کی وجہ سے ان کے مقدر کا ستارہ عروج پہ پہنچ گیا اور "صدر جہاں" کے خطاب کے ساتھ ہی پوری سلطنت کے قاضی ہو گئے۔ "طبقات ناصری" تاریخ پر ان کی ممتاز تصنیف ہے۔ اس دور میں ان کی خطابت کی بھی بڑی دھوم تھی۔ محاصرۂ گوالیار کے دوران ان کی تقریر نے حوصلہ اور جرأت و شجاعت پیدا کرنے میں بڑا کام کیا۔ لاہور کے عوام نے منگولوں سے شکست کے بعد مقابلہ کا حلف قاضی سراج کے خطاب سے متاثر ہو کر ہی اٹھایا تھا۔ ان کی تقریر کے شیدائی محبوب الٰہی بھی رہ چکے ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

> میں ہر پیر کو ان کے وعظ میں ناغہ کئے بغیر جاتا تھا کیونکہ ان کے وعظ میں بڑی راحت ہوتی تھی۔
> ان کی تقریر کے بارے میں (گویا) کان زبان حال سے یوں کہتے تھے کہ:

تو زلب سخن کشادی ہمہ خلق بے زباں شد تو برہ خرام کردی ہمہ دیدہ با رواں شد

> (بات تمہارے ہونٹوں سے نکلی اور ساری مخلوق بے زباں، گنگ ہو کر رہ گئی تم کسی راہ چلے اور ساری نگاہیں بھی (ساتھ ساتھ) اٹھنے لگیں)
>
> آپ فرماتے ہیں ایک روز میں ان کے وعظ میں ذوق کے مارے ایسا بے خود ہوا گویا میں مردہ ہوں یا کیا ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے میں نے اپنے آپ کو کسی سماع (قوالی) میں یا حال کے دوران ایسا نہیں پایا تھا۔[۳]

منہاج کی حیثیت عرفی آج اگرچہ "طبقات ناصری" کی وجہ سے مورخ کی ہے، مگر اہل علم اس

---

[۳] فوائد الفواد، ص ۱۵۵۔

بات کے معترف ہیں کہ قاضی اور عالم شریعت کی حیثیت سے بھی اس کا رتبہ بہت بلند ہے۔ شیخ اکرام نے لکھا ہے: ہماری فقہی روایات کا سنگ بنیاد رکھنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا[۴]۔ دوسری جگہ لکھا ہے "دارالقضا میں معاملہ فہمی، حقیقت پسندی اور ایک فعّال طریق کار کی جو روایات منہاج نے قائم کی انہیں ان کے نواسے صدرالدین عارف نے نباہا"۔[۵]

منہاج اور سلسلۂ ارادت: قاضی منہاج کس سلسلے سے نسبت رکھتے تھے یہ تو پتہ نہیں چلتا مگر ان کی بزرگی کا اعتراف شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے کیا ہے کہ وہ بڑے جلیل القدر بزرگ اور اپنے زمانے کے مشہور فاضل تھے[۶]۔ غالباً چشتی سلسلے سے نسبت ہوگی کیونکہ وہ سماع کے دلدادہ تھے اور محفل سماع میں بڑے وجد و حال سے گزرتے تھے۔ ان کی وارفتگی کو دیکھ کر کسی نے ان سے کہا تھا: تم صرف قضا (ججی) کے لائق نہیں ہو بلکہ تم تو اس لائق ہو کہ شیخ الاسلام بنو۔[۷]

سماع کے رواج دینے میں جہاں قاضی حمید الدین ناگوری کا نام نمایاں ہے وہیں قاضی منہاج الدین بھی نا قابل فراموش شخصیت ہے۔ فقہ اسلامی میں ان کی کوئی قلمی یادگار نہیں ہے مگر فقہ اسلامی کے ایک اہم منصب پر تقرری ان کی قابلیت کی ہی بنا پر ہوئی ہوگی۔ انہوں نے قضا کے معاملے کو اپنی صلاحیت سے ایک نیا رخ دیا ہے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (۱۱۷۳ء-۱۲۳۵ء): دہلی کی بڑی مقتدر شخصیت حضرت خواجہ کی ہے۔ یہ سلسلۂ چشتیہ کے قابل قدر بزرگ ہیں۔ حضرت سلطان الہند کے جانشین اور ولایت دہلی کے تاجدار ہیں۔ اس جگہ کو ان کے لئے ان کے مرشد نے پسند کیا تھا۔ ان کے عملی احوال سے تصوف کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان کے علمی احوال کے مطالعے سے ان کا فقہ اسلامی سے لگاؤ اور دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ نرے صوفی نہیں تھے بلکہ انھوں نے باضابطہ تحصیل علم کے بعد میدان عمل میں قدم رکھا تھا۔ ان کی فقہی قابلیت کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے جسے فرشتہ

---

[۴] آب کوثر، ص ۱۳۶، شیخ اکرام، فرید بکڈپو دہلی ب۔ت۔۔

[۵] آب کوثر، ص ۱۳۶۔

[۶] اخبار الاخیار اردو، ص ۱۷۹، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

[۷] فوائد الفواد، ص ۱۵۵۔

نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

جب آپ دہلی میں وارد ہوئے تو اس وقت دہلی کے شیخ الاسلام شیخ جمال الدین محمد بسطامی تھے۔ ان کی رحلت کے بعد شمس الدین التمش نے خواجہ کو منصب شیخ الاسلام کی تکلیف دی۔ اور جب شیخ نے قبول نہ فرمایا تو شیخ نجم الدین صغری کو اس منصب سے نوازا۔[(۸)]

شمس الدین التمش کا حضرت خواجہ کو اس منصب کے لئے منتخب کرنا ان کے تبحر علمی کی وجہ سے تھا۔ حضرت خواجہ کو فقہ اسلامی سے بڑا لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ اپنے چہیتے مرید بابا فرید الدین کو اسے حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت خواجہ کاکی سے ملاقات کے وقت بابا فرید کے بغل میں ایک کتاب تھی۔ آپ نے پوچھا: تمہارے بغل میں کون سی کتاب ہے؟ عرض کی کتاب "نافع فقہ"۔ خواجہ نے زبان مبارک سے فرمایا: ان شاءاللہ یہ تمہیں نافع ہوگی اور انہیں خوب علم حاصل کر کے صحبت اختیار کرنے کی تاکید کی اور کہا: زاہد بے علم مسخر شیطان ہو جاتا ہے۔ اس نصیحت کی بنا پر بابا فرید نے قندھار جا کر پانچ سال تک علم حاصل کیا اور علمی میدان میں وہ کمال حاصل کیا کہ جب سماع کے سلسلے میں مخالف علما نے اعیان و صدور مملکت سے فتوی طلب کیا تو انہوں نے یہ جان کر کہ یہ معاملہ بابا فرید کا ہے مستفتیوں سے رنجیدہ ہو کر کہا: "تو نے اس درویش کا نام لکھا ہے کہ مجتہدین کو مجال نہیں کہ اس کے قول پر اعتراض کریں"۔[(۹)]

حضرت بابا فرید کا یہ فقہی مقام اور ان سے دوسروں تک پہنچنے والا فقہی فیضان یقیناً حضرت خواجہ ہی کی ترغیب کی بدولت ہے۔

قاضی حمید الدین ناگوری (۵۱۵ھ-۶۲۵ھ): آپ کا شمار ہندوستان کے ان اکابر مشائخ میں ہوتا ہے جو علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتے تھے۔ آپ سلسلۂ سہروردیہ کے مشہور بزرگ حضرت شہاب الدین سہروردی صاحب "عوارف المعارف" کے خلیفۂ مجاز ہیں۔ ذوق سماع سے مالامال تھے۔ مؤرخین نے ہندوستان میں سماع کے مروجین میں ان کے نام کو سرِ فہرست رکھا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کی علمی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے: "آپ علوم

---

(۸) تاریخ فرشتہ جلد ۴، ص ۴۵۷، محمد قاسم فرشتہ اردو۔

(۹) تاریخ فرشتہ، ج ۴، ص ۴۵۷۔

شریعت وطریقت کے حقائق پر مکمل دسترس رکھتے تھے"[۱۰]۔ آپ نے قلمی یادگار بھی چھوڑی ہیں جن میں "طوالع الشموس" مشہور ہے مگر فقہ اسلامی پر ان کی کوئی یادگار نہیں۔

حضرت نظام الدین المویدؒ: حضرت محدث دہلوی نے انہیں شمس الدین التمش کے زمانے کے مشہور بزرگوں میں شمار کیا ہے۔ یہ حضرت کاکی کے ہمعصر تھے۔ ان کے پر سکون ذوق عبادت نے محبوب الٰہی کو بڑا متاثر کیا تھا جیسا کہ فوائدالفواد میں ہے: "مسجد میں تشریف لاکر دو رکعت نماز ادا کی۔ میں نے ان کی طرح کسی کو (اس سے پہلے اس طرح) اطمینان اور سکون سے نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا"۔ آپ کا خطاب بھی بڑا موئثر ہوتا تھا۔ سامعین پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ لوگ آہ وزاری کرنے لگتے تھے۔ عہد التمش کے فقہا میں آپ کا بھی نام نمایاں رہا ہے مگر راہ درویشی اختیار کرنے کی وجہ سے قلمی یادگار نہیں چھوڑی۔ چنانچہ شیخ اکرام نے لکھا ہے:

> سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں بے شمار علما اور فقہا دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ بعض کے نام محفوظ ہیں مثلاً قاضی فخر الائمہ قاضی و شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ نظام الدین المؤید غزنوی، قاضی قطب الدین کاشانی، نجم الدین صغری وغیرہ (آب کوثر ۱۲۹)۔

شیخ نورالدین مبارک غزنوی (۵۵۵ھ-۶۳۲ھ): آپ کی ولادت غزنی میں ہوئی۔ آپ حسینی سید تھے۔ خاندان اہل اللہ سے محبت کرنے والا تھا۔ اس وقت شیخ احل بڑے مشہور بزرگ تھے ایک تاجر نے اپنے نومولود کے لئے دعا کی درخواست کی۔ شیخ احل نے بعد نماز فجر حاضر ہونے کو کہا۔ اسی شب شیخ نورالدین تولد ہوئے۔ ان کے والد نے شیخ احل سے دعا کرانے کا ارادہ کیا۔ فجر بعد تاجر کو آنے میں تاخیر ہوئی اور شیخ مبارک پیش کر دیے گئے۔ دعا دی اور کہا: یہ نعمت تو سید زادے کی قسمت میں تھی۔ ان کی دعا کا اثر ان کے حق میں مبارک ثابت ہوا۔ تحصیل علم کے بعد آپ نے ان سے اکتساب فیض کیا۔ شیخ شہاب الدین نے خلافت سے نوازا اور التمش کے عہد میں دہلی کے شیخ الاسلام اور میر دہلی منتخب ہوئے۔ بادشاہ بھی آپ کی علمی عظمت کا قدر دان تھا اور موقع موقع سے دعاؤں کا طلبگار رہتا۔ انہوں نے بادشاہ کو خیر کی نصیحت کرنے میں کسی طرح کی تساہلی نہیں برتی۔ اس کی خلاف شرع باتوں کی تردید کی، خدمت دین پر ابھارا، اسلام کے فروغ وسربلندی کا سامان

---

[۱۰] اخبار الاخیار اردو، ص ۹۰، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

کرنے پر زور دیا، اسلامی سلطنت کو جرائم سے پاک کرنے کی تدبیر رکھی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے کی تلقین کی۔ ان کا علمی رتبہ بڑا بلند تھا مگر فقہ اسلامی میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔

حضرت نظام الدین محبوب الٰہی: حضرت محبوب الٰہی کے آباو اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ منگولوں کے حملے کے وقت ہندوستان آئے اور لاہور میں ٹھہرے۔ مگر یہاں کے حالات پرسکون نہ ہونے کی وجہ سے یوپی کے شہر بدایوں میں آکر بس گئے۔ ان کے نانا خواجہ عرب بھی ساتھ آئے تھے۔ بعد میں خواجہ عرب کی صاحبزادی بی بی زلیخا کی شادی خواجہ علی بخاری کے صاحبزادے خواجہ احمد سے ہوگئی۔ حضرت محبوب الٰہی کی ولادت بدایوں میں ماہ صفر کے آخری بدھ کو ہوئی۔ سن ولادت بعض نے ۶۳۶ھ اور بعض نے ۶۳۴ھ لکھا ہے۔ اول کو صحیح ماننے سے آپ کی تاریخ ولادت ۲۴ صفر ۶۳۶ھ بمطابق ۱۴ اکتوبر ۱۲۳۸ء ہے۔ والد کا انتقال قبل ولادت یا بعد ولادت بہت جلد ہوگیا۔ ان کی وفات کے سلسلے میں سیر الاولیا اور دوسری کتابوں میں آتا ہے کہ ان کی والدہ کو بیٹے کا رتبہ دکھاتے ہوئے دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کو کہا گیا تھا۔ مگر صحیح یہی ہے کہ اللہ تعالی کی مرضی تھی کہ ان کے والد کا بچپن میں انتقال ہوگیا۔ آپ کا نام محمد رکھا گیا۔ ان کے لقب کے بارے میں برہان الدین غریب نے کہا ہے: ہمارے خواجہ گھر میں تشریف فرما تھے کہ کسی نے آواز دی مولانا نظام الدین۔ حضرت نے سوچا یہ تو میر القب نہیں اور نہ گھر میں کوئی دوسرا موجود ہے پھر یہ آواز کسے دی جارہی ہے۔ جب آپ گھر سے باہر نکلے تو ہر ملنے والا انہیں نظام الدین کہہ کر مخاطب کرتا۔ بالآخر آپ کے نام سے زیادہ اشارۂ غیبی سے ملنے والا یہ لقب مشہور ہوگیا۔ ایک زمانے میں آپ کو نظام الدین والملت نظام الاولیا بھی کہا گیا اور آج زیادہ تر لوگ حضرت نظام الدین اولیا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم بدایوں میں ہوئی۔ ناظرہ اور ابتدائی نحو و صرف محلے میں پڑھی اور اوسط درجے کی کتاب کا درس شہر کے ممتاز علما سے حاصل کیا۔ جب آپ نے فقہ حنفی کی مشہور کتاب "قدوری" علامہ علاء الدین اصولی کے پاس ختم کرلی تو استاد نے انہیں دستار دینے کا ارادہ کیا۔ آپ نے استاد کے ارادے سے ماں کو آگاہ کیا۔ والدہ نے روئی خرید کے خود اور کنیز سے کتوائی۔ محلے کے نور باف نے اس سوت سے دستار تیار کیا۔ دستار اور چہل خوردہ (غالباً چالیس چھوٹے سکے) لے کر

استاد کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ استاد نے اس میں اضافہ کر کے کھانا بنوایا اور اور موقع کو مزید مسرت آفریں بنانے کے لئے علی مولا نامی بزرگ کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا۔ ان کی زبان بڑی پر تاثیر تھی۔ جو کہتے تھے ہو جاتا تھا۔ جب دستار باندھی جانے لگی تو محبوب الٰہی نے فرط عقیدت سے اپنا سر مولانا کے قدموں میں رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر مولا بزرگ نے بڑے ہونے کی بشارت دی۔ ان کے الفاظ تھے: "ارے مولانا یہ بڈا ہوسی"، یعنی ارے مولانا یہ بڑا آدمی بنے گا۔ نہ صرف بڑا بلکہ بزرگ بننے کی بشارت بھی سنائی۔ آپ پر دونوں باتیں صادق آئیں۔

علامہ علاء الدین اصولی: حضرت محبوب الٰہی کا سلسلۂ تعلیم بدایوں میں "قدوری" پر منتہی ہو گیا تھا۔ ان کے استاد علامہ اصولی کے سلسلے میں اہل علم کا قیاس ہے کہ وہ فن اصول فقہ میں ماہر تھے اس لئے انہیں اصولی کہا جاتا تھا۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے انہیں صاحب کمال بزرگ کہا ہے اور ان کے مکارم اخلاق اور غیرت و خودداری کی تعریف کی ہے۔ ان کے اعلیٰ اخلاق کی نسبت فرماتے ہیں:

> مولانا اپنے بچپن کے زمانے میں بدایوں کی ایک گلی میں جا رہے تھے۔ شیخ جلال الدین تبریزی نے آپ کو دیکھ کر اپنی طرف بلایا۔ اس وقت جو لباس شیخ جلال الدین خود زیب تن کئے ہوئے تھے وہ اتار کر اس نوجوان کو پہنا دیا۔ مولانا میں جو کچھ عمدہ اخلاق اور اعلیٰ اوصاف تھے وہ اسی لباس کی برکت سے تھے۔[۱۱]

مولانا اصولی بڑے غیور و خوددار تھے۔ کسی کی دولت و ثروت سے لالچ رکھنا تو در کنار، کسی کے تحفے تحائف تک قبول نہیں کرتے تھے۔ شیخ نے ان کی خودداری کے اس واقعہ کو ان کے تذکرہ میں جگہ دی ہے:

> ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ فاقوں کی وجہ سے کھلی چبا رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک حجام آیا۔ آپ نے اس بات کو مناسب نہ سمجھا کہ میرے فقر و فاقہ کی اس کو اطلاع ہو۔ اس لئے وہ کھلی اپنے عمامے میں چھپالی۔ پھر مولانا نے خط بنوایا اور سر کو منڈوانے کے لئے سر سے جب عمامہ اتارا تو وہ کھلی زمین پر گر گئی۔ اس حجام نے کچھ دنوں بعد یہ واقعہ ایک مالدار شخص سے بیان کر دیا

---

[۱۱] اخبار الاخیار اردو، ص ۱۷۴، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

تو اس نے کئی من غلہ، کئی گھڑا گھی اور ایک ہزار جیتل* مولانا کی خدمت میں روانہ کیا۔ لیکن مولانا نے یہ ہدیہ قبول نہ کیا اور واپس کر دیا[۱۲]۔ اسی کے ساتھ انہوں نے حجام کو اپنی خدمت سے برطرف کر دیا لیکن بعد میں احباب کی سفارش پر اس شرط کے ساتھ رکھ لیا کہ فقرا کے راز کو راز ہی رہنے دے۔

حضرت محبوب الٰہی کی خوش قسمتی تھی کہ جس میدان میں قدم رکھا تائید الٰہی سے اس میدان کا شناور اور حاذق ہی آپ کا معلم و مربی ہوا، خواہ راہ شریعت ہو یا راہ طریقت۔ بدایوں میں تکمیل تعلیم کرنے کے بعد آپ معاش کے ساتھ ساتھ ازدیاد علم کے لئے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت دہلی میں اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں تھیں اور اہل فن کا یہاں جم غفیر بھی تھا۔ ان کے دہلی آنے اور دور طالب علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرشتہ نے لکھا ہے:

> بدایوں کے جملہ علما سے اکتساب فیض کیا اور جب کوئی اعلیٰ معلم نہ رہا تو خواجہ شمس الدین خوارزمی کی، جو بلبن کے عہد میں وزیر ہوئے اور شمس الملک کے خطاب سے ملقب ہوئے، شاگردی اختیار کی۔ ان کی درسگاہ کی ترتیب یہ تھی کہ تین انتہائی ذہین طلبا مطالعہ کے کمرے میں اور باقی باہر بیٹھتے تھے۔ محبوب الٰہی کے دوران طالب علمی میں جن تین کو حجرہ میں جگہ ملی ان میں ایک ملا قطب الدین خان، ملا برہان الدین عبد الباقی اور شیخ نظام الدین اولیا تھے اور جب شیخ نے آپ کی مولویت اور تیزی فہم پر آگاہی پائی تو شاگردوں سے آپ کی تعظیم میں اوروں سے زیادہ اہتمام کرتے تھے۔[۱۳]

دہلی میں تعلیم کا سلسلہ چار سال تک جاری رہا۔ جن مایۂ ناز اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں شمس الدین خوارزمی، برہان الدین بلخی اور امین الدین محدث تبریزی ہیں۔ بدایوں میں آپ نے ادب، لغت اور فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مقامات حریری کے چالیس مقامات زبانی یاد کر لئے تھے جس پر بعد میں متأسف بھی ہوئے کہ وقت ضائع ہو گیا۔ دہلی میں حدیث کا درس لیا اور مشارق الانوار

---

* یہ چاندی کا سکہ تھا۔

[۱۲] اخبار الاخیار اردو، ص ۱۷۹، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

[۱۳] تاریخ فرشتہ جلد ۴، ص ۷۶۳، محمد قاسم فرشتہ اردو۔

زبانی یاد کی۔ ان کے مشہور استاذ مولانا برہان الدین بلخی ہیں۔ ہندوستان میں ''ہدایہ'' کی ابتدا انہوں نے کی ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ انہوں نے فقہ کی تعلیم ان سے لی ہو۔ تاریخ میں آیا ہے کہ علوم شرعی اور فقہی کو آپ نے بڑی محنت اور تن دہی سے حاصل کیا(۱۴)۔ وجہ یہ تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ کہیں کا قاضی مقرر ہو جاؤں اور اس عہدے کے لئے فقہ میں جس حذاقت کی ضرورت تھی آپ نے وہ قابلیت حاصل کرلی تھی۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آپ نے دہلی کے مشہور بزرگ حضرت شیخ نجیب الدین المتوکل سے اس سلسلے میں دعا کی فرمائش کی تھی چنانچہ ان کے سوانح نگار نے لکھا ہے:

> اس زمانے میں جب کسی بزرگ سے دعا کرانی ہوتی تو فاتحہ کا التماس کیا جاتا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھتا اور مقصد دلی کے لئے دعا کرتا تھا۔ قیام دہلی کے ابتدائی زمانے میں، جب حضرت کسی سے بیعت نہیں ہوئے تھے اور سر پر بال رکھتے تھے، حضرت شیخ نجیب الدین متوکل سے فاتحہ کا التماس کیا۔ شیخ نے سنی ان سنی کر دی۔ شیخ نظام الدین نے تین بار گذارش کی کہ میرے لئے اس نیت سے فاتحہ پڑھ دیجئے کہ میں قاضی ہو جاؤں۔ شیخ متوکل نے فاتحہ کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے اور مسکرا کر فرمایا: ''تو قاضی مشو، چیزے دیگر شو'' (تم قاضی مت بنو، کچھ اور بنو)۔(۱۵)

محبوب الٰہی، بابا فرید کی روحانی شخصیت سے ایک زمانے سے متأثر تھے۔ سلسلۂ چشتیہ کا فیض پانے کے لئے ان کے دربار میں حاضر ہوئے مگر علم کا شوق یہاں بھی دامن گیر ہوا اور بابا فرید سے عرض گذار ہوئے: میں ایک طالب علم ہوں، سلسلۂ تعلیم جاری رکھوں یا اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاؤں؟ ان کی بات سن کر مرشد نے کہا: میں کسی کو پڑھنے سے نہیں روکتا۔ درویش کے لئے تھوڑا علم بھی ضروری ہے۔ تم دونوں شغل جاری رکھو اور دیکھو کون سا غالب آتا ہے۔ بابا فرید کی شخصیت کس علمی پایہ کی تھی اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ محبوب الٰہی بدایوں اور دہلی کے ناموران فن سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بابا فرید سے علم باطنی کے ساتھ ساتھ علم ظاہر بھی حاصل کرنے لگے۔ آپ نے بابا فرید سے عقائد میں ''التمہید فی بیان التوحید''، تصوف میں عوارف المعارف و لوائح اور

---

(۱۴) آب کوثر، ص ۱۳۶، شیخ اکرام، فرید بکڈپو دہلی سال ندارد۔

(۱۵) فوائد الفؤاد ص ۶۹۔

تجوید پڑھی۔ تعلیم کے منتہی ہونے پر جو کتابیں پڑھیں ان کی فہرست سے محبوب الٰہی کی فقہی مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے: بزدوی (اصول فقہ) قدوری اور مجمع البحرین (فقہ)، کافیہ اور مفصل (نحو)، تصوف میں احیاء العلوم، عوارف المعارف، کشف المحجوب، قوت القلوب، رسالۂ قشیریہ، مرصادالعباد، لوائح اور لوامع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جو اجازت نامہ بابافرید سے ملا اس کے الفاظ سے سلطان المشائخ کی علمی عظمت کا پتہ چلتا ہے:

"الولد الرشيد، الإمام النقي، العالم الرضي، نظام الملة والدين، محمّد بن احمد، زين الائمة والعلماء مفخر الأجلة والأغنياء"

(فرزند رشید، امام پاک دین، پاک داناو برگزیدہ، دین محمدی کو آراستگی دینے والے، محمد پسر احمد، اماموں کو زیب دینے والے، بزرگوں وعالموں اور مفتیوں کے لئے باعث فخر)۔[۱۶]

حضرت محبوب الٰہی سے صرف سلسلہ چشتیہ ہی فروغ نہیں پایا بلکہ ان کی علمی جلالت کے فیضان سے درسگاہوں کے مسند پر حاذق فن کی حاضری سے علم بالخصوص فقہ اسلامی کو بھی بڑا فروغ ملا۔ ان کے مرید و خلفا میں بڑے قابل افراد تھے جیسے کہ مولانا شمس الدین یحیٰ، مولانا علاء الدین، قاضی محی الدین کاشانی، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، مولانا فخر الدین زرادی۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی: حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی علاقہ اودھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی والدہ نے اعلیٰ درجے کی تعلیم دی۔ پچیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تحصیل سے فارغ ہو کر کمالات باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۴۳ سال کی عمر میں دہلی آکر محبوب الٰہی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ شیخ عبد الحق نے ان کا تعارف کراتے ہوئے ان کے علمی کمال کا اعتراف کیا ہے: "یاران طریقت کے مرشد، عالم حقیقت کے بادشاہ، جس کا ظاہر وباطن صاف، جو محبت اور وفاداری کی کان تھا، علم وعقل اور عشق وزہد میں لاثانی"[۱۷]

شیخ کا معمول عام چشتیوں کے مقابلے میں سماع کی مخالفت کا رہا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی رہی ہو کہ علمی اور فقہی احکام ان پر غالب تھے اور پیری مریدی کرنے کے بھی رسیا نہیں تھے بلکہ کہتے تھے

---

[۱۶] سیر الاولیا، میر خرد کرمانی، ص ۱۳۰، کاشف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۱۹۹۹ء۔

[۱۷] اخبار الاخیار اردو، ص ۲۴۷، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

کہ میں کس لائق ہوں کہ جو پیری مریدی کروں۔ آپ گوشہ نشینی کے خواہاں تھے مگر مرشد گرامی نے خلق کے درمیان رہ کر پر مصائب زندگی جھیلنے کی تاکید کی اور آپ نے اپنی مرضی کے خلاف مگر مرضیِ مرشد کے موافق دہلی میں خلق کے درمیان زندگی گذاری۔ خیر المجالس میں ان کی فقہی مہارت کی وجہ سے انہیں اپنے زمانے کا ''امام ابو حنیفہ'' کہا گیا ہے، مگر اس فن پر آپ کی کوئی تصنیف نہیں۔ اس کے باوجود فقہی تاریخ میں اپنے مرشد کے طرز پر بڑے بڑے فقہا کے روحانی مربی ہوئے ہیں اور ان کے فقہی فیض سے ہندوستان کی تاریخ فقہ مالا مال ہے۔ ملک العلما کے خطاب سے سرفراز قاضی شہاب الدین دولت آبادی آپ ہی کے خوشہ چیں تھے جنہوں نے آپ کے حلقۂ ارادت کے اسیر قاضی عبد المقتدر اور مولانا خواجگی سے علم حاصل کیا تھا۔ حضرت چراغ دہلوی اپنے مریدوں سے اس کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ علم میں مشغول رہ کر شریعت کی حفاظت کرتے رہو۔

حضرت چراغ دہلوی کے ایک مرید مولانا رکن الدین نے فقہی مضامین کے متعلق ایک طویل مثنوی ''طرفۃ الفقہا'' کے نام سے لکھی اس میں تیس ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔

قاضی عبد المقتدر: آپ حضرت نصیر الدین دہلوی کے خلفا میں سے ہیں۔ آپ بڑے ذی علم تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں شیخ نصیر الدین سے پڑھا کرتے تھے اور بحث و مباحثہ میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ شیخ آپ کے اس بحث و مباحثہ کو بہت پسند فرماتے اور مزید علم کے حصول کی ترغیب دلاتے تھے۔ قاضی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہزار رکعت عبادت جس میں ریاکاری اور مکاری شامل ہو ان پر افضلیت اس لمحے کو ہے جس میں کسی شرعی مسئلہ پر غور و فکر کیا جائے۔[۱۸]

مولانا احمد: حضرت چراغ دہلوی کے مریدوں میں ایک عظیم فقہی شخصیت مولانا احمد کی ہے۔ رہنے والے تھانیسر کے تھے۔ اخیر وقت میں کالپی چلے گئے اور درمیانی وقت دلی میں گذارا۔ دلی سے اسیر ہو کر امیر تیمور گرگان کی قید میں تھے لیکن ان کی علمی شان کی وجہ سے امیر نے رہائی دی اور درباری مقرر کیا۔ امیر تیمور کی سلطنت کے شیخ الاسلام صاحب ''ہدایہ'' کے پوتے تھے۔ ایک دن امیر تیمور نے ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا: انہیں جانتے ہیں؟ یہ صاحب ہدایہ کے پوتے ہیں۔

---

(۱۸) اخبار الاخیار اردو، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۲۶۔

مولانا احمد نے کہا ان کے دادا نے "ہدایہ" کے اندر کئی جگہ غلطیاں کی ہیں۔ مولانا نے کہا: کہاں غلطی ہے دکھائیں۔ اس پر انہوں نے کہا اگر ایک آدھ غلطی ہوتی تو حرج کی بات نہیں تھی۔ اس پر صاحب ہدایہ کے پوتے دلائل سے نشاندہی کے خواستگار ہوئے۔ شیخ عبد الحق لکھتے ہیں "اس پر مولانا نے اپنے بیٹوں اور تلامذہ سے فرمایا کہ صاحب "ہدایہ" کی غلطیوں پر مفصل تقریر شروع کریں لیکن امیر تیمور نے صاحب ہدایہ کی عزت وناموس کی حفاظت کی غرض سے اس مجلس کو کسی دوسرے موقع پر ملتوی کر دیا۔[19]

مولانا معین الدین عمرانی: اس عہد کے ایک بڑے عالم مولانا معین الدین عمرانی ہیں۔ فقہ اسلامی پر ان کی تصانیف کا بھی پتہ چلتا ہے۔ شیخ عبد الحق نے لکھا ہے: "آپ بہت بڑے عالم اور شہر بھر کے استاذ تھے۔ آپ کی مشہور تصانیف حاشیہ کنز الدقائق، حسامی اور مفتاح ہے"۔[20]

سید یوسف بن سید جمال الحسینی: دہلی کو مستقر بنانے والے صاحب تصانیف بزرگوں میں آپ کا نام ہے۔ آپ ملتان سے دہلی فوجی ملازمت کی غرض سے آئے تھے مگر علمی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے سلطان فیروز نے اپنے مدرسۂ خاص کا مدرس مقرر کر دیا۔ فقہ اسلامی میں آپ کی تصنیف "توجیہ الافکار" ہے جو منار کی شرح ہے۔

شیخ حسام الدین ملتانی: آپ خواجہ نظام الدین کے خلفا میں سے ہیں۔ محبوب الٰہی انہیں شہر دہلی کا نگراں کہا کرتے تھے۔ صاحب علم تھے۔ مگر عجز وانکساری کے پیکر تھے۔ خود کو شیخ کہلانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے "یا شیخ" کہہ کر بلایا تو کہنے لگے میں شیخ نہیں ہوں بلکہ ادھ مرا ملا فقیر ہوں۔ فقہ اسلامی کی "ہدایہ" اور "بزدوی" جیسی کتابیں ان کے مطالعے میں رہا کرتی تھیں۔ تصوف میں "قوت القلوب" اور "احیاء العلوم" بھی تھی۔ بہت دنوں تک دہلی میں رہ کر اخیر عمر پٹن (گجرات) جا کر گذارا اور وہیں وصال فرمایا۔

شیخ برہان الدین محمود بلخی (م: ۶۸۳ھ): آپ غیاث الدین بلبن کے دور کے بڑے عالم تھے۔

---

[19] اخبار الاخیار اردو، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۴۔

[20] اخبار الاخیار اردو، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۳۔

شیخ عبدالحق نے انہیں علوم شریعت وطریقت کا جامع کہا ہے۔ آپ نے "مشارق الانوار" کو اس کے مؤلف امام حسن صنعانی لاہوری سے پڑھی تھی۔ صاحب "ہدایہ" کی زیارت بچپن میں کر چکے تھے۔ ان کی پیشانی دیکھ کر صاحب ہدایہ نے بڑے عالم ہونے کی بشارت بھی دی تھی۔ بڑے ہو کر علامہ مرغینانی سے "ہدایہ" پڑھا اور دہلی میں اس کتاب کے درس کا آغاز کیا۔ اگرچہ وہ عہدۂ قضاۃ پر فائز نہیں تھے مگر فقہ اسلامی کی معرکۃ الآرا کتاب "ہدایہ" کو دہلی اور ہندوستان میں پہلے پہل آپ نے رواج دیا۔ ان کے بارے میں شیخ اکرام نے لکھا ہے:"مولانا برہان الدین بلخی اپنے وقت کے زبردست عالم تھے۔فقیہ اور محدث تھے"۔[۲۱] ان کا مزار حوض شمسی کے مشرقی سمت میں واقع ہے جسے تختۂ نور کہتے ہیں۔

حضرت سید محمد بندہ نواز گیسودراز: ایک مشہور بزرگ تھے جو گلبرگہ میں مقیم ہوگئے۔ وہ حضرت چراغ دہلوی کے مرید اور دہلی کے باشندے تھے۔ انہوں نے مختلف فنون پہ قلم اٹھایا اور شرح "فقہ اکبر" عربی وفارسی میں لکھی۔

مولانا بدر الدین اسحق: شیخ عبد الحق نے انہیں علوم ربانی کے ماہر اور دقیق معانی کے کاشف کہا ہے۔ یہ جملہ علوم وفنون میں اپنے اقران پر فائق تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ تمام علوم پر تاحد انتہا فائق ہو جائیں۔ کچھ علوم میں مشکلات باقی تھیں۔ بخارا کے عازم ہوئے۔ راستے میں بابا فرید کی مجلس میں شریک ہوئے تو ان کی تقریر سے جملہ مشکل مسائل حل ہو گئے اور بخارا جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

وہ دہلی کے بیشتر مشائخ علم فقہ میں فائق تھے۔ صوبہ بہار کے عالم گیر شہرت کے حامل بزرگ شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کا علمی وجود دہلی ہی کا مرہون منت ہے۔ جب شیخ شرف الدین ابو تمامہ سونار گاؤں جا رہے تھے تو اسی سفر میں مخدوم بہار سے ملاقات ہوئی اور ان کی خدمت میں رہ کر دیگر علوم کے ساتھ فقہ اسلامی میں بھی مہارت حاصل کی۔

دہلی میں فقہ اسلامی کی بڑی بڑی کتابیں تصنیف ہوئی جن میں اہم کتاب "فتاوی غیاثیہ" غیاث الدین بلبن کے عہد کی تصنیف ہے۔ "فتاوی قراخانی" جلال الدین فیروز خلجی کے عہد کا

[۲۱] آب کوثر، ص ۱۳۸، شیخ اکرام، فرید بکڈپو دہلی سال ندارد۔

نادر مجموعہ ہے جس میں استفتا اور جوابات ہیں جسے مولانا یعقوب مظفر کرمانی نے ترتیب دیا ہے۔ "فوائد فیروز شاہی" فارسی زبان میں فقہ کے ساتھ دوسرے مسائل پر مشتمل ہے۔ اسے شرف محمد عطائی نے ترتیب دیا ہے۔ "فتاوی تاتار خانیہ" فقہ اسلامی کی ایک ضخیم کتاب ہے جس کی تعریف صاحب کشف الظنون نے کی اور اسے "فتاوی قاضی خان" کی ٹکر کی کتاب قرار دیا ہے۔ اس کا نام "زاد السفر"، "زاد المسافر" اور "زاد المسافر فی الفروع" بھی ہے۔ اسے عالم بن علا اندر پتی نے ترتیب دیا ہے۔ "فتاوی بابری" بابر سے منسوب ہے۔ فقہ پر بابر کی ذاتی تصنیف "مبین" ہے جس کی شرح شیخ زین الدین خوافی نے مرتب کی ہے اور انھوں نے ہی فتاوی بابری کو مرتب کیا ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں دہلی اور دیگر علاقوں کے علمانے، جن کی تعداد کم و بیش پچاس تک پہنچتی ہے، دو لاکھ کے صرفے سے "فتاوی ہندیہ" المعروف بہ "فتاوی عالم گیری" مرتب کیا ہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی: عہد اکبری کے بڑے علما میں ایک مشہور نام شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا ہے۔ بدایونی نے لکھا ہے: "آپ کا تخلص حقی تھا۔ علوم عقلی و نقلی دونوں سے بہرہ یاب اور ہنر و کمال کا مجموعہ تھے۔ تصوف میں بھی آپ کا درجہ بلند تھا"[۲۲]۔ ان کی شہرت دنیا میں علم حدیث کی خدمات کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے عرب جا کر بخاری و مسلم شریف کا درس لیا اور اس کی تدریس کا آغاز ہندوستان میں کیا۔ حدیث کی شروحات لکھیں۔ سیرت، سوانح، تصوف وغیرہ فنون پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ علمی حلقوں میں آپ کی بات معتبر مانی جاتی تھی۔ انہیں قادری اور نقشبندی دونوں سلسلے میں شرف ارادت حاصل تھا۔ ان کی سوانح سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہے۔

یہاں صرف ان کی فقہی حیثیت کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔ آپ نے شروحات حدیث میں فقہی مسائل کا خاص اہتمام کیا ہے اور حدیث سے فقہ حنفی کی تائید و توثیق کی ہے۔ ان کی کتابوں میں فقہی مسائل کی کثرت دیکھ کر اہلحدیث فرقے کے افراد انہیں محدث قرار دینے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے لکھا ہے: "وہ مذہب حنفی کے فقیہ و علامہ ہیں۔ بحیثیت محدث مشہور ہیں۔ حدیث سے زیادہ علم فقہ پر انہیں دسترس حاصل ہے۔ اسی لئے

---

[۲۲] منتخب التواریخ، اردو، ملا عبد القادر بدایونی، جے کے آفسیٹ، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۴۵۸۔

اہل الرائے کے جانبدار ہیں۔ اس کے باوجود جابجا حدیث صحیحہ کی بھی تائید کی ہے"[۲۳]۔

شیخ نے اپنی تصنیف میں فقہی مسائل کو حدیث کے ضمن میں بڑی خوبصورتی سے ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں مکمل کام شروحات کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔

شاہ عبد الرحیم دہلوی: آپ شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد ہیں۔ اپنے خاندان کی علمی وجاہت کے مؤسس اعلیٰ آپ ہی ہیں۔ آپ نے میر محمد زاہد سے معقولات کی تعلیم لی۔ تصوف میں خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ خرد سے تربیت حاصل کی اور دہلی میں مدرسہ رحیمیہ قائم کر کے اشاعت علم کا کام کیا۔ ان کے بارے میں شاہ ولی اللہ کا قول ہے: "میں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو عام علوم میں عموماً اور فقہ وحدیث میں خصوصاً ان کی طرح تبحر رکھتا ہو"[۲۴]۔ آپ فتاوی عالم گیری کی ترتیب میں کچھ دنوں تک شریک رہے مگر درویشانہ طبیعت مزاج شاہی سے میل نہ کھائی اور مرشد کے اشارے کی وجہ سے الگ ہو گئے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی: شاہ ولی دہلوی ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ آپ جامع العلوم بھی تھے اور جامع السلوک بھی۔ ان کی شخصیت سے سارے فرقے کے لوگ متاثر ہوئے اور انہیں اپنے عقائد و معمولات کا مؤید مانتے ہیں۔ ان کے سلسلے میں کہا گیا ہے: "شاہ ولی اللہ کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی جامعیت ہے یعنی وہ اختلافی مسائل میں ایسا راستہ ڈھونڈ ھتے ہیں اور علمی وسعت کی مدد سے اکثر ایسا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس پر فریقین متفق ہو سکیں۔[۲۵] انہوں نے بہت سے فنون پر تصنیفات چھوڑی ہیں اور اسلامی احکام کی علت کے ضمن میں حجۃ اللہ البالغہ میں بھی فقہی مسائل زیر بحث لائے ہیں اگر چہ انہوں نے فقیہانہ طرز پر اسے نہیں لکھا ہے، البتہ انہوں نے فقیہانہ طرز سے ہٹ کر تاریخ فقہ اور تقلید وعدم تقلید کے عنوان پر، جو کہ فقہ اسلامی کا ہی باب ہے، بڑی جامع کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" اور "عقد الجید فی الاجتہاد والتقلید" لکھی ہے۔

---

[۲۳] رود کوثر، شیخ اکرام، فرید انٹر پرائزز، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۸۴۔

[۲۴] رود کوثر، شیخ اکرام، فرید انٹر پرائزز، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۵۳۵۔

[۲۵] رود کوثر، شیخ اکرام، فرید انٹر پرائزز، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۵۳۶۔

شاہ عبد العزیز دہلوی: آپ شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے ہیں۔ آپ نے اپنے والد اور ان کے شاگردسے علم حاصل کیا اور شاہ صاحب کے علمی سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ وہ بہت سے علوم کے ساتھ فقہ اسلامی کے بھی ماہر تھے۔ ان کی تصنیف "تحفہ اثنا عشری" بہت مقبول ہے۔ ان کے فتاوی کا مجموعہ "فتاوی عزیزیہ" کے نام سے مطبوع ہے۔ ان کے فتاوی نے اس دور میں امت مسلمہ کی رہبری کا اچھا فریضہ انجام دیا ہے اور فقہی اصول کو بروئے کار لاکر انہوں نے جامع فتاوی صادر فرمائے ہیں بالخصوص دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث اور انگریزی ادارے میں تحصیل علم کی حیثیت سے ان کی رہنمائی لائق تحسین ہے۔ ان کے فتاوی کے مجموعے کا اردو ترجمہ "سرور عزیزی المعروف فتاوی عزیزی" کے نام سے مولوی عبد الواجد غازیپوری نے کیا ہے اور ایجوکیشنل پریس کراچی سے پہلی بار ۱۳۸۷ھ میں مطبوع ہوا ہے۔ اس میں ان ابواب پر سوال وجواب کی شکل میں فتاوی ہیں: باب التفسیر والتشریح، باب العقائد، باب التصوف، باب الخلافت، باب الفقہ۔

مرزا مظہر جان جاناں (م: ۱۷۸۱ء): تصوف اور اردو ادب کی خدمت کے لئے مشہور ہوئے اور ہندوستانی مذاہب کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ قابل قبول نہیں سمجھا گیا۔ ان کے مرید شاہ عبداللہ المعروف بہ شاہ غلام علی دہلوی، جوکہ ان کے جانشیں بنے، ان کے حالات زندگی میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انہوں نے خانقاہ میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا جیسا کہ مرقوم ہے:

"اول وقت نماز ظہر ادا فرما کر پھر درس وتدریس حدیث وفقہ وکتب وتصوف میں مشغول ہوتے"[۲۶]۔

ان کی ذات سے بیرون ہند سلسلہ نقشبندیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

دہلی کی شاہی یادگاروں میں بیگم شاہ جہاں کی تعمیر کردہ مسجد فتحپوری ہے جس کی اہمیت دہلی کے مسلمانوں کی جامع مسجد کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ اس مسجد کے ائمہ خانوادہ حضرت جلال الدین تھانیسری کی نسل سے ہوتے رہے ہیں۔ اس خانوادے میں حضرت شاہ مسعود بڑے عالم گذرے ہیں۔ ان کا مجموعۂ فتاویٰ قلمی صورت میں موجود ہے۔ اپنے عہد میں مرجع فتاوی تھے۔ ان کے بعد ان کے فرزند مولانا شاہ سعید احمد منصب امامت پر فائز ہوئے۔ ان کی نسل میں ایک جید عالم دین مولانا مفتی مظہر اللہ شاہ ہوئے ہیں جن کی ولادت ۲۱/اپریل ۱۸۸۶ء کو ہوئی۔ انہوں

---

[۲۶] رود کوثر، شیخ اکرام، فرید انٹرپرائزز، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۶۵۳۔

نے معاصر اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ ان کی علمی صلاحیت کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود صاحب رقمطراز ہیں:

فقہ، اصول فقہ، علم الفرائض، اور علم المواقیت میں مہارت تامہ حاصل کی۔ دیگر علوم مثلاً تجوید و قرات، تفسیر، اصول تفسیر، عقائد و تصوف، منطق و فلسفہ، صرف و نحو، ادب و شاعری، خطاطی اور عملیات وغیرہ میں بھی بڑی دستگاہ تھی۔ ہر مسلک فکر کے علما آپ کے وسعت مطالعہ اور تبحر علمی کے دل سے معترف تھے۔[۲۷]

یہ خانوادہ سلسلہ نقشبندیہ سے وابستہ رہا ہے۔ آپ سید امام علی شاہ کے صاحبزادے سید صادق علی شاہ سے نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت تھے۔ بیعت کے دوسرے سال مرشد کا انتقال ہو گیا تو روحانی تربیت ان کے فرزند شاہ رکن الدین سے حاصل کی۔ ۱۹۴۶ء میں مولانا عبدالرشید صاحب کے گوشہ نشینی اختیار کرنے کے بعد آپ منصب امامت و خطابت پر فائز ہوئے۔ آپ کے دور میں اس مسجد کی شوکت میں اضافہ ہوا۔ خلق خدا آپ کی طرف رجوع ہوتی تھی۔ اہالیان محلہ زیارت کے مشتاق رہتے تھے۔ فتاوی نویسی کا حال یہ تھا کہ مختلف صوبے کے مستفتی کے استفتا جواب طلبی کے لئے آتے اور آپ بہت باریک بینی سے فتوی نویسی کرتے۔ ہزار احتیاط کے باوجود کسی قول سے رجوع کی ضرورت پیش آتی تو ہرگز شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔ تنقید کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

سرزمین دہلی صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ ہر دور میں روحانی مرکز کی حیثیت سے بھی شہرت پذیر رہی ہے اور یہاں کے مشائخ نرے صوفی نہیں رہے بلکہ علوم اسلامی پر ان کی نظر بڑی گہری رہی ہے۔ یہ علمی روایتیں جاری تھیں اور جاری ہیں۔ اب بھی ان مشائخ کے خانوادے کے افراد علم و فن کی خوشبو بکھیر رہے ہیں۔ ماضی قریب کا ایک معتبر نام مفتی محمد میاں ثمر دہلوی کا ہے۔ اسی شاخ سے ڈاکٹر مفتی مکرم صاحب تعلق رکھتے ہیں۔ وہ طویل عرصے سے شاہی مسجد فتحپوری کے امام و خطیب ہیں۔ فتوی نویسی میں خاندانی روایت کے امین ہیں۔

---

[۲۷] فتاوی مظہریہ، مفتی مظہر اللہ، مرتب پروفیسر مسعود، شاہکار پریس، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۵۔

امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمہ اللہ کا رسالۂ اعتقادیہ

ڈاکٹر سہیل شوقین
اسسٹنٹ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ہائر ایجوکیشن، جموں وکشمیر
suhailshowkeen99@gmail.com

امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمہ اللہ (م:۷۸۶ھ/۱۳۸۵ء) تاریخ اسلام کی ایک مایۂ ناز شخصیت ہیں۔ آپ بیک وقت ایک بلند پایہ عالم، مفکر، داعی، مصلح، سیاح اور صوفی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کی شخصیت کی اسی جامعیت و ہمہ جہتی سے متاثر ہو کر علامہ اقبال رحمہ اللہ (م:۱۹۳۸ء) نے آپ کو درج ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے: "سید السادات، سالارِ عجم دست او معمار تقدیر امم"[۱] (وہ سادات کے سردار اور عجم کے سالار ہیں۔ ان کے ہاتھ امتوں کی تقدیر کے معمار ہیں)۔ آپ امیر کبیر، شاہ ہمدان، علی ثانی اور محسن کشمیر کے القابات سے یاد کئے جاتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام (م:۱۹۷۳ء) آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> آپ بڑے صاحب علم بزرگ گزرے ہیں اور اسلامی دنیا کی روحانی تاریخ میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپ کی ذات میں جلالی و جمالی شانیں دونوں موجود ہیں اور مذہب سے واقفیت اور روحانی عزو مرتبت کے علاوہ منتظمانہ قابلیت بھی آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔[۲]

میر سید علی ہمدانی رحمہ اللہ کے علمی مقام و مرتبہ کا اندازہ ان تالیفات کے ذریعہ ہوتا ہے جو آپ نے اپنے پیچھے چھوڑیں۔ انتہائی مصروف اور سعی پیہم وجہد مسلسل سے عبارت زندگی گزارنے کے باوجود آپ نے تصانیف کا ایک قیمتی ذخیرہ تحریر فرمایا۔ بعض محققین کے مطابق آپ کی چھوٹی بڑی تالیفات کی تعداد ایک سو کے قریب ہے[۳]۔ بعض دوسرے محققین کے مطابق ان کی تعداد

---

[۱] محمد اقبال، جاوید نامہ، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۸۵۔

[۲] شیخ محمد اکرام، آب کوثر، فرید بکڈپو لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۴ء، ص ۳۷۷۔

[۳] ڈاکٹر سیدہ اشرف ظفر، سید میر علی ہمدانی، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز، سری نگر، کشمیر، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۵؛
Muhammad Ashraf Wani, *Islam in Kashmir,* Gulshan Books, 2023, p. 258.

ڈیڑھ سو سے متجاوز ہے[۴]۔ ان تصانیف میں ایک اہم کتاب "رسالۂ اعتقادیہ" ہے۔ اس کی اہمیت اس اعتبار سے دوچند ہو جاتی ہے کہ اس سے حضرت امیر رحمہ اللہ کے عقیدے کی توضیح کے ساتھ ساتھ آپ کے فقہی مسلک پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے اور آپ کے مسلک و مذہب کے بارے میں پھیلائے گئے شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ رسالۂ اعتقادیہ فارسی زبان میں ہے اور شاہ ہمدان رحمہ اللہ نے اسے بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں آپ نے ان عقائد کا ذکر کیا ہے جن پر ایمان لانا ایک صحیح العقیدہ مسلمان کے لیے لازمی ہے۔ دوسرے حصے میں آپ نے بعض فصول کے تحت کئی فقہی مسائل کو جمع کیا ہے جس سے آپ کے فقہی مسلک کا تعین ہوتا ہے۔ اس رسالے کا پہلا حصہ چونکہ عقائد کے بیان کے لیے مختص ہے اسی لیے اس رسالے کا نام رسالۂ اعتقادیہ قرار پایا۔ یہ رسالہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک متن سے مشابہ ہے اور کچھ بعید نہیں کہ امیر کبیر نے اسے اپنے تلامذہ کی تعلیم کے لیے تحریر کیا ہو۔

آپ نے اس رسالے میں عقائد کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ سنی المذہب تھے اور اہل سنت کے مکاتب فکر و عقیدہ میں سے آپ کا تعلق مدرسۂ اشاعرہ کے ساتھ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے بعد آپ نے جس بات سے اپنے رسالے کا آغاز کیا ہے وہ علم کلام کے اہم مسائل میں سے ایک ہے۔ علم کلام میں اس مسئلے پر کافی بحث ہوئی ہے کہ بندے پر سب سے پہلا واجب کیا ہے اور مختلف فرقوں نے اس سوال کے مختلف جوابات دیے ہیں۔ حضرت شاہ ہمدان رحمہ اللہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بندے پر سب سے پہلا واجب پروردگار عالم کی معرفت ہے کہ یہی معرفت عرفان کی اساس اور ایقان کی معراج ہے۔ آپ لکھتے ہیں: (پہلی چیز جو بندے پر واجب ہے وہ پرودگار کی معرفت ہے کیونکہ اسے پہچاننا معرفت کی اساس اور یقین کی معراج ہے اور اسے چھوڑ دینا دل و جان کی تاریکی اور ایمان و اسلام کا نقصان ہے)۔[۵]

---

(۴) Prof. Abdul Qaiyum Rafiqi, *Sufism in Kashmir,* Gulshan Books, Srinagar, Kashmir, 2015, p. 100.

(۵) میر سید علی ہمدانی، رسالۂ اعتقادیہ، تحقیق: احسان فتاحی اردکانی، سہ ماہی 'میثاق امین' فصل نامۂ پژوھشی، شمارہ سوم تابستان، قم، ایران، ۱۳۸۶ء، ص ۲۴۵۔

اس کے بعد شاہ ہمدان رحمہ اللہ نے اس معرفت پروردگار کے معنی تفصیل سے یوں بیان فرمائے ہیں: اس معرفت میں یہ شامل ہے کہ اس بات پر پختہ یقین رکھا جائے اور یہ جانا جائے کہ اس آسمان وزمین کا بنانے والا صرف ایک ہے جس کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔ وہ یگانہ ہے اس کا کوئی مثل نہیں۔ وہ ہمیشہ سے تھا، اس کی ہستی کا اول نہیں اور ہمیشہ رہے گا، اس کے وجود کا کوئی آخر نہیں۔ وہ واجب الوجود ہے، عدم اور نہ ہونے کا اس کے یہاں گذر نہیں۔ وہ قائم بالذات ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں اور نہ تو کوئی شخص اور چیز اس سے بے نیاز ہے[۶]۔ شاہ ہمدان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس معرفت میں یہ جاننا بھی شامل ہے کہ:

> وہ نہ تو جوہر ہے اور نہ ہی عرض ہے۔ اور کسی جگہ میں اس کا اترنا نہیں۔ نیز وہ نہ کسی جگہ پر ہے اور نہ کسی جگہ میں ہے اور کوئی جگہ اس کے بغیر نہیں۔ اس کی نہ تو کوئی صورت ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس کے مانند ہے۔ کتنے، کیسے اور کس طرح کا اس کی جناب قدس میں گزر نہیں۔ کمیت میں سے جو کچھ دل میں گزرے اور کیفیت میں سے جو کچھ بھی خیال میں آئے حضرت صمدیت اس سب سے مبرا و منزہ ہے۔[۷]

حضرت شاہ ہمدان رحمہ اللہ کی یہ عبارت صراحتاً ان کے اشعری ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اس عبارت کو اول الذکر عبارت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے پیش نظر اسلامی تاریخ کے دو مشہور فرقوں مشبہ اور معطلہ کا رد ہے۔ اس کے بعد آپ اللہ تعالیٰ کی صفت "علو" اور صفت "استواء" کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں: "اور عالم اور جو کچھ اس میں ہے عرش کے نیچے ہے اور عرش اور غیر عرش سب کو اس کا لطف و قدرت اٹھائے ہوئے ہے اور وہ قدرت وعظمت کے ساتھ عرش کے اوپر ہے"۔[۸]

شاہ ہمدان کے فکر و نظر پر جن اہل علم کے کافی گہرے اثرات ہیں ان میں امام غزالی (۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ نے اپنی کتابوں میں امام غزالی سے کافی استفادہ کیا ہے اور بعض مقامات پر ان کی کتابوں سے صفحات نقل کئے ہیں۔

---

[۶] ماخذ سابق۔

[۷] ماخذ سابق، ص ۲۴۵-۲۴۶۔

[۸] ماخذ سابق، ص ۲۴۶۔

شاہ ہمدان مزید فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت میں یہ بھی شامل ہے کہ اس بات کا مکمل اعتقاد رکھا جائے کہ اس کی ذات متعالیہ جس طرح ازل میں تھی، اسی طرح آج بھی ہے اور تا ابد ویسی ہی رہے گی۔ نیز تغیر، گردش اور نقص کو اس کی صفات میں کوئی گذر نہیں۔ اس جہاں میں اس کی مقدس ذات کو بے مثال و بے نظیر جاننا آخرت میں بے مثال و بے نظیر دیکھنے کی کلید ہے۔ شاہ ہمدان اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفت علم و قدرت پر اعتقاد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ جو چاہے اس پر قادر ہے۔ اس کا حکم و قدرت تمام اشیاء پر رواں ہے۔ عاجزی اور نقص کو اس کی ذات ستودہ صفات میں قطعاً گذر نہیں۔ عرش و فرش اور اس میں موجود ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں مسخر و مقہور ہے۔[9]

جہاں تک اس کے علم کا تعلق ہے تو وہ تمام چیزوں کو محیط ہے۔ عرش سے لے کر زمین تک کوئی بھی چیز اس کے علم سے باہر نہیں بلکہ ہوا کے ذرات، دریا کے قطرات، درختوں کے پتے، ریگستان کی ریت اور جانوروں کی سانسیں اس کے علم میں اسی طرح روشن اور ظاہر ہیں جس طرح ہر شخص کے لیے اس کی اپنی انگلیوں کی تعداد اس کے لیے روشن و ظاہر ہے[10]۔ اس تفصیل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امیر کبیر کے پیش نظر ان فلاسفہ کا رد ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے جزئیات (particulars) کے علم کے منکر تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کو صرف کلیات (universals) کا علم ہے۔ نیز آپ فلاسفہ کا رد کر کے اس نظریۂ علم (epistemology) کا اثبات کرتے ہیں جو قرآن و سنت پر مبنی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی علم و قدرت کے بیان کے بعد اس کی مشیت پر ایمان لانے کا بیان کرتے ہوئے حضرت امیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ایمان کے معنی میں یہ باتیں شامل ہیں:

> نیک و بد، قبول و رد، کم و زیادہ، وزن و شمار، نصرت و خذلان، عطا و حرمان، سود و زیان، کفر و ایمان، تنگدستی و تونگری، لذت و مشقت، رنج و راحت، معصیت و اطاعت میں سے جو کچھ تھا، جو کچھ ہے اور جو آئندہ ہوگا سب اس کے ارادے اور قضا سے ہے اور کوئی بھی چیز اس کی مشیت اور

---

[9] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۴۶۔

[10] ماخذ سابق

حکم سے باہر نہیں۔ جو اس نے چاہا ہو گیا اور جو وہ چاہے گا ہو گا اور اس کے فیصلے کو کوئی رد کرنے والا نہیں اور نہ اس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا ہے۔ [۱۱]

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ کی عبارت اس سلسلہ میں قابل ملاحظہ ہے:

اور اللہ تعالیٰ کائنات کا ارادہ کرنے والا اور حادثات کی تدبیر کرنے والا ہے۔ پس ملک و ملکوت میں کچھ بھی قلیل یا کثیر، چھوٹا یا بڑا، خیر یا شر، نفع یا نقصان، ایمان یا کفر، عرفان یا نکر، کامیابی یا ناکامی، زیادتی یا کمی، اطاعت و نافرمانی نہیں ہوتا مگر اسی کی قضا و قدر اور حکمت و مشیت سے۔ پس جو اس نے چاہا ہوا اور جو اس نے نہیں چاہا نہیں ہوا۔ [۱۲]

صفات الٰہیہ پر حضرت امیر فرماتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ علم و قدرت کے ساتھ طاقتور اور دانا ہے، اسی طرح وہ سمع و بصر اور کلام کے ساتھ سنتا، دیکھتا اور کلام فرماتا ہے لیکن اس کا سننا کان کے بغیر، دیکھنا آنکھ کے بغیر اور کلام کرنا زبان کے بغیر ہے۔ نیز دوری و نزدیکی، چھوٹا پن اور بزرگی اور تاریکی و روشنی اس کے سننے اور دیکھنے میں برابر ہے [۱۳]۔ مذکورہ بالا صفات کے بارے میں بعینہ یہی اشاعرہ کا موقف ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت "کلام" اہل سنت والجماعت اور بعض اسلامی فرقوں کے درمیان خیر القرون سے ہی ایک زبردست اختلاف کا موضوع رہی ہے۔ اہل سنت "کلام" کو اللہ تعالیٰ کی صفت قدیمہ مانتے ہیں جس سے وہ ازل سے متصف ہے۔ اس کے برعکس معتزلہ "کلام" کو اللہ کی تخلیق مانتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ جب چاہتا ہے تو کلام کو کسی چیز میں تخلیق کرتا ہے اور بعد ازاں اس کلام کی اپنی طرف اضافت کر کے اسے شرف بخشتا ہے۔ اس اضافت کو إضافة التشريف کہا جاتا ہے۔ اب چونکہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، لہٰذا معتزلہ کے نزدیک وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ یہیں سے تاریخ اسلامی کا وہ مشہور فتنہ رونما ہوا جسے فتنۂ خلق قرآن کہا جاتا ہے اور جس میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بے نظیر استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اہل سنت والجماعت کے

---

[۱۱] ماخذ سابق

[۱۲] ابو حامد محمد بن محمد الغزالي، إحياء علوم الدين، دار المنهاج، جدة، ۲۰۲۱، ج ۱، ص ۳۴۱۔

[۱۳] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۴۷۔

عقیدے کا دفاع کیا اور "امام اہل سنت والجماعت" کا لقب پایا۔ عقیدہ وکلام کی دیگر کتابوں کی طرح حضرت امیر رحمہ اللہ نے بھی اللہ تعالیٰ کی صفت کلام پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اخبار غیب، وعدو وعید، حق وباطل، حرام وحلال اور امر و نہی میں سے اپنے بندوں کی اطلاع کے لیے جو کچھ فرمایا وہ سب حق ہے اور تمام کتابیں جو اس نے اپنے پیغمبروں پر اتاریں اسی کا کلام ہیں [۱۴]۔ آگے فرماتے ہیں:

> اور اس کا کلام اس کی صفت ہے اور اس کی صفات سب کی سب قدیم ہیں، اس طرح کہ اس کا سننا کان سے نہیں اور اس کا دیکھنا آنکھ سے نہیں اور نا ہی اس کا بولنا لب و دہان اور کام و زبان کے ساتھ ہے۔ نیز اس کا سخن آواز و حرف کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کا کلام مصاحف میں مکتوب، زبانوں پر مذکور اور دلوں میں محفوظ ہے۔ کتابت، ذکر اور حفظ مخلوق ہیں اور مکتوب، مذکور اور محفوظ غیر مخلوق ہیں۔ [۱۵]

مذکورہ بالا اقتباس میں جہاں معتزلہ کا رد ہے وہیں اس میں ان حنابلہ سے بھی اختلاف کیا گیا ہے جو اللہ تعالی کے کلام کو حرف وصوت پر مشتمل مانتے ہیں۔ حضرت امیر رحمہ اللہ نے دیگر مسائل کلامیہ کی طرح "مسئلہ حرف وصوت" میں بھی اشاعرہ کی ہمنوائی کی ہے۔

اللہ تعالی کی ذات وصفات پر تفصیلی کلام کے بعد حضرت شاہ ہمدان رحمہ اللہ علم کلام کے مبحث "سمعیات" کی طرف آتے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ رزق، اجل، عذاب قبر، سوال منکر ونکیر، قیامت کے دن قبر سے اٹھنا، حشر ونشر، حوض کوثر، ترازو، حساب، صراط، دیدار الٰہی، بہشت ودوزخ، انبیا، اولیا، علمائے دین اور مؤمنین کی شفاعت کے بارے میں جو کچھ بھی اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے وہ سب حق ہے اور اس سب پر ایمان لانا واجب ہے۔ [۱۶] اس کے معاً بعد حضرت امیر رحمہ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء والمرسلین ہونے کو بایں الفاظ بیان فرماتے ہیں: "اور بہترین مخلوق پیغمبر ہیں اور درجۂ نبوت ہمارے

---

(۱۴) ماخذ سابق۔

(۱۵) ماخذ سابق۔

(۱۶) ماخذ سابق۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے کمال کو پہنچ گیا۔ اس لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم انبیاء کہتے ہیں۔"(۱۷)

اس عبارت میں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت اور افضلیت کا ذکر ہے وہیں ان بعض گمراہ صوفیوں کا بھی رد ہے جو درجۂ ولایت کو نبوت سے افضل سمجھتے ہیں اور نبوت پر ولایت کی برتری اور فوقیت کے گمراہ کن عقیدے کے قائل ہیں۔

سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے عقیدت و محبت کا تعلق اور ان سب کی عدالت و فضیلت کا عقیدہ اہل سنت والجماعت کے یہاں ہر دور میں نہایت اہمیت کا حامل مسئلہ رہا ہے۔ صحابۂ کرام سے عقیدت وولاء کا یہ تعلق اہل سنت والجماعت کو دیگر اسلامی فرقوں سے ممیز کرتا ہے۔ اہل سنت والجماعت اپنی حقیقت کے اعتبار سے مدرسۂ صحابہ کا ہی تسلسل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت و الجماعت کے عقیدے کی چھوٹی سے چھوٹی کتاب میں بھی صحابۂ کرام کے بارے میں ان کے عقیدے کا بیان پایا جاتا ہے۔ مشکل سے ہی ان کے عقیدے کی کوئی کتاب ہو گی جو صحابہ کرام کے بارے میں ان کے عقیدے کے ذکر سے خالی ہو۔ حضرت امیر کبیر رحمہ اللہ چونکہ اہل سنت کے کبار علماء، علمائے صوفیہ میں سے ہیں اسی لیے آپ کی یہ کتاب بھی اس اہم امسئلہ کے ذکر سے خالی نہیں۔ چنانچہ آپ اپنا عقیدہ بایں الفاظ بیان فرماتے ہیں:

> اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین لوگ ہیں اور ان میں بہترین خلفائے راشدین ہیں اور وہ [یہ] چار ہیں: ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ۔ اللہ تعالی ان سے اور تمام مہاجرین وانصار سے راضی ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ آل پر۔(۱۸)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہی عقیدہ اہل سنت کا عقیدہ ہے اور خلفائے راشدین کی یہی ترتیب ان کے نزدیک صحیح ہے۔ صحابہ کے بارے میں کم وبیش یہی الفاظ ہمیں حضرت امیر کی

---

(۱۷) ماخذ سابق، ص ۲۴۸۔

(۱۸) ماخذ سابق۔

دوسری اہم کتاب "ذخیرۃ الملوک" میں ملتے ہیں[۱۹]۔ مزید برآں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی یہی ترتیب ہمیں حضرت امیر رحمہ اللہ کے اس زمزمۂ توحید میں بھی ملتی ہے جو آپ نے اہلیانِ کشمیر کو عطا فرمایا ہے، جو "اورادِ فتحیہ" کے نام سے معروف ہے[۲۰] اور جسے اہلیانِ کشمیر صدیوں سے تواتر کے ساتھ پڑھتے آرہے ہیں بلکہ حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اپنے عقیدے کے بیان کے ساتھ ہی اس رسالہ کا پہلا حصہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اس حصے کے مندرجات سے ہمیں حضرت امیر کبیر رحمہ اللہ کے عقائد کا پوری قطعیت کے ساتھ علم ہو جاتا ہے جس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آپ رحمہ اللہ سنی المذہب تھے اور اہل سنت کے عقائدی مدارس میں سے بھی آپ کا تعلق مدرسۂ اشاعرہ کے ساتھ تھا۔

رسالۂ اعتقادیہ کا دوسرا حصہ فقہ سے متعلق ہے۔ یہ حصہ کل اکیس فصول پر مشتمل ہے جن میں حضرت امیر رحمہ اللہ نے طہارت اور عبادات میں صرف نماز اور روزے کے بنیادی مسائل فقہ شافعی کے مطابق بیان فرمائے ہیں۔ عبادات میں فقط نماز اور روزے کے مسائل کے ذکر پر اکتفا کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

> جان لے کہ ارکانِ مسلمانی پانچ ہیں: کلمۂ شہادت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ حج اور زکوٰۃ کا رکن غریب سے ساقط ہے۔ [البتہ] تین ارکان کی رعایت غریب پر بھی واجب ہے یعنی کلمہ کی حقیقت جاننا اور اسے مداومت کے ساتھ پڑھنا اور نماز اور روزہ۔[۲۱]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے یہ رسالہ ان غریب طلبہ اور عوام کے لیے تحریر فرمایا ہے جن کے پاس اتنا مال نہیں کہ ان پر حج یا زکوٰۃ واجب ہو۔ یہ دونوں دو ارکان چونکہ ان پر فرض نہیں ہیں اسی لیے آپ نے ان سے متعلق احکام کو بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔

فصل: طہارات و نجاسات کے بیان میں: حضرت شاہ ہمدان رحمہ اللہ اس پہلی فصل کا آغاز اس اہم نکتے سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بعد بندے پر اس کی بندگی کے آداب کی معرفت

---

[۱۹] میر سید علی ہمدانی، ذخیرۃ الملوک، مؤسسۂ تاریخ و فرہنگ، ایران، ۱۹۷۹ء، ص ۱۷۔

[۲۰] السید میر علي بن شهاب الدين الهمداني، أوراد فتحية، المكتبة المكية، المدينة المنورة، ۱۴۴۲ھ، ص ۱۸۔

[۲۱] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۶۰۔

حاصل کرنا واجب ہے کہ یہی اللہ تعالی کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اب چونکہ تمام عبادات کا سر نماز ہے اور نماز کی کنجی طہارت ہے اس لیے آپ نے ابتدائی آٹھ فصلوں کو احکام طہارت کے بیان کے لیے مختص کیا ہے۔ اس پہلی فصل میں آپ نے سب سے پہلے پانی کی اقسام پر کلام فرمایا ہے کیونکہ طہارت اصلاً پاک پانی کے حصول پر موقوف ہے۔ آپ نے پانی کی اقسام میں طاہر مطہر اور نجس پانی کے احکام کو قدرے تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ ماء قلیل اور ماء کثیر کی طہارت و نجاست کے احکام کو بھی مثالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے اور ان دونوں کے فرق کی بنیاد حدیث قلتین کو بنایا ہے[۲۲]، یعنی جو پانی قلتین[*] کے برابر یا اس سے زیادہ ہے وہ ماء کثیر ہے اور جو پانی اس سے کم ہے وہ ماء قلیل ہے جیسا کہ فقہائے شافعیہ کا مسلک ہے[۲۳]۔ اس کے علاوہ پاک اور ناپاک اشیاء نیز جانوروں اوران کی کھالوں کی دباغت سے متعلق احکام کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ نجاسات تو ہیں مگر شریعت نے انسان کے کپڑے یا جسم پر ان کے لگنے کی صورت میں درگذر فرمایا ہے اور جنہیں اصطلاح فقہ میں النجاسات المعفوعنها[○] کہا جاتا ہے۔ ان کے مسائل ذکر کرنے کے بعد آپ نے مشرکین کے برتنوں اور ان کے کپڑوں کی طہارت و نجاست کے احکام کو اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ فصل کے آخر پر آپ نے سونے اور چاندی کے برتنوں کے استعمال کا حکم بیان فرمایا ہے۔[۲۴]

فصل: احکام استنجاء کے بیان میں: دوسری فصل میں حضرت امیر رحمہ اللہ نے استنجاء کے احکام و مسائل کو ذکر کیا ہے۔ اس فصل میں آپ نے جن مسائل کے ساتھ تعرض کیا ہے وہ یہ ہیں: استنجاء کا حکم، وہ چیزیں جن سے استنجاء جائز ہے، وہ چیزیں جن سے استنجاء جائز نہیں ہے، قبلہ اور چاند اور سورج

---

[۲۲] ماخذ سابق، ص ۲۴۸۔

[*] قلتین، قُلّة کی تثنیہ ہے یعنی دو قُلّة۔

[۲۳] محمد بن أحمد الخطيب الشربيني، مغني المحتاج إلى معرفة معاني ألفاظ المنهاج، دار الفيحاء، دمشق، ۲۰۲۲م، ج۔ ۱، ص ۱۱۲-۱۱۳۔

[○] یعنی وہ نجاستیں جن کے بارے میں درگذر فرمایا گیا ہے۔

[۲۴] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۴۸-۲۴۹۔

کی طرف منہ کر کے قضائے حاجت کا حکم اور استنجاء و قضائے حاجت کے آداب۔[۲۵]

فصل: وضو کے واجبات و مستحبات کے بیان میں: اس فصل کو آپ نے وضو کے واجبات و مستحبات کے بیان کے لیے مختص کیا ہے۔ آپ نے وضو کے چھ فرائض اور دس سنتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ فرائض وضو یہ ہیں: نیت، چہرہ دھونا، دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھونا، سر کے کچھ حصے کا مسح کرنا، پاؤں دھونا اور ترتیب کا خیال رکھنا[۲۶]۔ وضو کے فرائض شافعی مذہب میں بھی یہی چھ ہیں[۲۷]۔ وضو کی دس سنتیں جن کے بیان پر آپ رحمہ اللہ نے اکتفاء فرمایا ہے یہ ہیں: بسم اللہ کہنا، ہتھیلیوں کو تین بار دھونا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، پورے سر کا مسح کرنا، دونوں کانوں کا مسح کرنا، گردن کا مسح کرنا، پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا، ہر عضو کی ابتداء دائیں سے کرنا، ہر عضو کو تین بار دھونا۔[۲۸]

یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے: پہلی یہ کہ حضرت امیر رحمہ اللہ نے اختصار کے پیش نظر وضو کی صرف دس سنتوں کا ذکر کیا ہے ورنہ شافعی مذہب میں وضو کی اور بھی کئی سنتیں ہیں جنہیں متعلقہ کتب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسری یہ کہ گردن کے مسح کے بارے میں خود شوافع کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شافعی علما کی ایک بہت بڑی تعداد اس کو سنت نہیں مانتی جبکہ بعض شافعی علما اس کو سنت قرار دیتے ہیں۔ امام نووی شافعی رحمہ اللہ (م:۶۷۶ھ) نے اپنی کتاب ''المجموع شرح المهذب'' میں اس مسئلہ پر تفصیلی کلام فرمایا ہے۔ اس ضمن میں علمائے مذہب کے اختلاف کو ذکر کرنے کے بعد آپ راجح رائے کو بایں الفاظ بیان فرماتے ہیں:

> اور چوتھا [قول] یہ ہے کہ یہ نہ سنت ہے اور نہ ہی مستحب اور یہ چوتھا [قول] ہی درست ہے۔ اسی لیے گردن کے مسح کو نہ تو امام شافعی رضی اللہ عنہ نے ہی ذکر کیا ہے اور نہ ہی ہمارے متقدم اصحاب نے جیسا کہ ہم پہلے ہی قاضی ابو الطیب سے ذکر کر چکے ہیں۔ نیز اکثر مصنفین نے بھی

---

[۲۵] ماخذ سابق، ص ۲۴۹-۲۵۰۔

[۲۶] ماخذ سابق، ص ۲۵۰۔

[۲۷] أحمد بن الحسين الأصفهاني الشافعي، مختصر أبي شجاع المسمى متن الغاية والتقريب، دار المنهاج، جدة، ۲۰۰۵م، ص ۱۷-۱۸۔

[۲۸] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۵۱۔

اسے ذکر نہیں کیا ہے۔ اسے صرف ان مذکورہ علمانے ابن القاص کی پیروی میں ذکر کیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کچھ بھی ثابت نہیں۔ [۲۹]

یہ رائے ہی اگرچہ راجح ہے مگر جیسا کہ ذکر گذرا بعض شافعی علما گردن کے مسح کے استحباب کے قائل ہیں اور ان قائلین میں ایک نمایاں نام امام غزالی کا بھی ہے[۳۰] اور یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ شاہ ہمدان رحمہ اللہ کے فکر و نظر پر امام غزالی کے کافی گہرے اثرات ہیں۔

فصل: مبطلات وضو کے بیان میں: چوتھی فصل میں آپ رحمہ اللہ نے ان چیزوں کو بیان کیا ہے جن سے انسان کا وضو باطل ہو جاتا ہے۔ آپ نے اس ضمن میں پانچ نواقض وضو کا ذکر کیا ہے۔ ایک جسم کے دو راستوں سے کوئی بھی چیز مثلاً ہوا یا قطرہ خارج ہونے سے۔ دوسرا عقل زائل ہونے سے۔ تیسرا نیند کا غلبہ ہونے سے یعنی سونے سے۔ ہاں اگر متمکن حالت میں سوئے تو اس صورت میں وضو نہیں ٹوٹے گا جیسا کہ سادات شافعیہ کا مسلک ہے[۳۱]۔ متمکن حالت سے یہ مراد ہے کہ انسان کی مقعد (تشریف) نیچے جمی ہوئی اور ٹکی ہوئی ہو اور ہوا کے خارج ہونے کا امکان نہ ہو۔ چوتھا ہاتھ اور انگلیوں سے اپنی یا کسی دوسرے کی شرمگاہ چھونے سے۔ اس سے مراد ہاتھ اور انگلیوں کے اندرونی حصہ سے چھونا ہے جیسا کہ شافعی علمانے صراحت فرمائی ہے[۳۲]۔ پانچواں مرد کا عورت کو چھونا الا یہ کہ وہ عورت محرم ہو جیسے ماں، بہن، بیٹی وغیرہ[۳۳]۔ محرمیت کی صورت میں وضو نہیں ٹوٹے گا۔ واضح رہے کہ غیر محرم مرد یا عورت کی ظاہری جلد کے مس ہونے سے دونوں کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ اس مسئلے کی تفصیل، دلائل اور شروط فقہ شافعی کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

---

[۲۹] أبو زکریا یحیی بن شرف الدین النووي، المجموع شرح المهذب، إدارة الطباعة المنيرية، مصر، ب.ت.، ج: ۱، ص: ۴۶۴۔

[۳۰] إحياء علوم الدين، ج: ۱، ص ۵۰۸۔

[۳۱] أبو عبد الله شمس الدين محمد بن قاسم الغزي، فتح القريب المجيب في شرح ألفاظ التقريب، دار ابن حزم، بيروت، ۲۰۰۵م، ص: ۳۹۔

[۳۲] مغني المحتاج، ج: ۱، ص ۱۵۸۔

[۳۳] رسالہ اعتقادیہ، ص ۲۵۱۔

فصل: احکام غسل کے بیان میں: پانچویں فصل میں آپ نے غسل کے احکام و مسائل کو بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مردوں پر غسل دو چیزوں سے واجب ہوتا ہے: ایک انزال منی سے چاہے جس بھی طرح سے ہو اور دوسرے حشفہ کے کسی شرمگاہ میں غائب ہونے سے جبکہ عورت پر چار چیزوں سے غسل واجب ہوتا ہے۔ ایک تو مذکورہ بالا دو چیزوں سے نیز حیض و نفاس سے[۳۴]۔ حضرت شاہ ہمدان رحمہ اللہ نے اختصار کے پیش نظر موجبات غسل میں موت اور عورت کے حق میں ولادت کو ذکر نہیں کیا ہے جبکہ ان دونوں سے سادات شافعیہ کے یہاں غسل واجب ہوتا ہے[۳۵]۔ اس کے بعد آپ نے غسل کے فرائض بیان فرمانے کے بعد اس کی سنتوں کی طرف بایں الفاظ اشارہ فرمایا ہے کہ غسل میں بھی وہی سنتیں ہیں جو وضو میں ہیں اور فصل کے اختتام پر آپ نے جمعہ اور عیدین کے غسل کا حکم ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: "اور جمعہ اور عیدین کا غسل سنت ہے"۔[۳۶]

فصل: موزوں پر مسح کا بیان: اس فصل میں موزوں پر مسح کے بعض احکام نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔ من جملہ اور احکام کے، مقیم اور مسافر کی مدت مسح بھی ذکر کی گئی ہے جو مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات ہے اور مسافر کے لیے تین دن اور تین رات[۳۷] جیسا کہ سادات شافعیہ کا مذہب ہے۔[۳۸]

فصل: تیمم کے احکام کے بیان میں: ساتویں فصل میں حضرت امیر رحمہ اللہ نے تیمم کے احکام و مسائل کو بیان کیا ہے۔ آپ نے اولاً ان صورتوں کو ذکر کیا ہے جن میں تیمم کرنا مشروع ہے۔ اس کے بعد آپ نے تیمم کے پانچ فرائض اور دو سنتوں کا بیان کیا ہے۔ واضح رہے کہ آپ نے یہاں پر بھی اختصار کے پیشِ نظر دو سنتوں کے بیان پر اکتفاء کیا ہے جب کہ شوافع کے یہاں تعداد اس سے

---

(۳۴) ماخذ سابق۔

(۳۵) متن الغایۃ والتقریب، ص: ۲۱۔

(۳۶) رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۵۲۔

(۳۷) ماخذ سابق۔

(۳۸) متن الغایۃ والتقریب، ص: ۲۳۔

زیادہ ہے[۳۹]۔ آخر میں فرماتے ہیں:

اور ہر فرض کے لیے تیمم کرے اور ایک تیمم سے دو فرض ادا نہ کرے۔ جہاں تک نوافل کا تعلق ہے تو ایک تیمم سے جتنے نوافل چاہے ادا کرے[۴۰]۔ اس سلسلے میں سادات شافعیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔[۴۱]

فصل: باطنی طہارت و نجاسات کے بیان میں: حضرت شاہ ہمدان رحمہ اللہ چونکہ کبار صوفیہ میں سے ہیں اسی لیے عبادات کے اسرار و حکم سے آپ کی نظر نہیں ہٹتی۔ طہارت کے ظاہری احکام ومسائل کے بیان کے بعد آپ نے اس آٹھویں فصل کو طہارت کے باطنی احکام کے لیے خاص کیا ہے۔ اس ضمن میں بھی امام غزالی رحمہ اللہ کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس فصل کا خلاصہ یہ ہے کہ طہارت کے تین درجے ہیں: پہلا درجہ لباس و جسم کو نجاسات سے پاک کرنا ہے۔ دوسرا درجہ نفس کو خباثتوں سے پاک کرنا ہے اور تیسرا درجہ دل کو ماسوی اللہ کے تعلق ونسبت سے پاک کرنا ہے۔ جو لباس و جسم کو نجاسات سے پاک نہ کرے وہ اہل شریعت کے نزدیک ناپاک ہے، جو اپنے نفس کو برے اخلاق سے پاک نہ کرے وہ اہل طریقت کے نزدیک ناپاک ہے اور جو دل کو غیر اللہ سے پاک نہ کرے وہ اہل کشف و تحقیق کے نزدیک ناپاک ہے[۴۲]۔ طہارت کی کچھ ایسی ہی تقسیم ہمیں امام غزالی رحمہ اللہ کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ طہارت کے آخری درجہ کے بارے میں آپ لکھتے ہیں: وهي طهارة الأنبياء صلوات الله عليهم والصديقين.[۴۳] (اور یہی انبیاء صلوات اللہ علیہم اور صدیقین کی طہارت ہے)۔

فصل: اوقات نماز کے بارے میں: نویں فصل میں حضرت امیر رحمہ اللہ مواقیت الصلاۃ کو زیر بحث لائے ہیں اور پنجگانہ نمازوں کے اوقات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہاں پر یہ بات توضیح

---

[۳۹] محمد بن أحمد الخطيب الشربيني، الإقناع في حل ألفاظ أبي شجاع، مكتبة دار الفجر، دمشق، ۲۰۱۵م، ج: ۱، ص: ۱۷۰۔

[۴۰] رسالۂ اعتقادیہ، ص: ۲۵۳۔

[۴۱] متن الغاية والتقريب، ص: ۲۴۔

[۴۲] رسالۂ اعتقادیہ، ص: ۲۵۳۔

[۴۳] إحياء علوم الدين، ج- ۱، ص: ۴۷۸۔

طلب ہے کہ حضرت امیر رحمہ اللہ نے نماز مغرب کے سوا باقی تمام نمازوں کے اول وآخر اوقات کا ذکر کیا ہے۔یعنی ہر نماز کا وقت کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں تک رہتا ہے۔ نماز مغرب کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ اس کا صرف ایک وقت ہے(۴۴)۔اس سے مراد یہ ہے کہ نماز مغرب کا وقت بس اتنی ہی دیر ہے جتنی دیر میں ایک انسان اذان، وضو، ستر عورہ*، اقامت اور مغرب کی پانچ رکعات سے فارغ ہو(۴۵)۔اس لحاظ سے مغرب کا وقت کافی تنگ ہے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ یہ امام شافعی مذہب کا جدید قول ہے۔ اصول یہ ہے کہ فتوی اور عمل جدید قول پر ہی ہو لیکن یہ مسلک میں ان گنتی کے چند مسائل میں سے ہے جن پر عمل قول جدید کے بجائے قول قدیم پر ہوتا ہے اور یہی معتمد ہے اگرچہ بعض شوافع حضرت امیر رحمہ اللہ کی طرح قول جدید پر عمل کے قائل ہیں۔ قول قدیم یہ ہے کہ نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب سے شفق احمر کے غائب ہونے تک ہے۔

امام محمد خطیب شربینی رحمہ اللہ (م:۹۷۷ھ) تحریر فرماتے ہیں:

> اور اس کا وقت قول قدیم کے مطابق شفق احمر کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔ امام نووی نے کہا ہے: "میں کہتا ہوں کہ (امام شافعی کے اقوال میں سے) یہی قول راجح ہے"۔ امام نووی (نے) المجموع میں کہا ہے کہ یہی قول جدید بھی ہے کیونکہ امام شافعی نے الإملاء میں، جو ان کی جدید کتب میں سے ہے، اس قول کو اختیار کرنا حدیث کی صحت پر موقوف رکھا اور اس میں بلاشبہ کئی احادیث ثابت ہیں جن میں مسلم کی یہ حدیث ہے: "مغرب کا وقت شفق کے غائب ہونے تک ہے"۔(۴۶)

علامہ محمد زہری غمراوی شافعی رحمہ اللہ (م:بعد ۱۳۲۳ھ) لکھتے ہیں:

> اور صحیح یہ ہے کہ اس کا وقت شفق احمر کے غائب ہونے تک باقی رہتا ہے اور اس [نماز] کی قضاء نہیں کی جاتی ہے جب تک کہ یہ وقت ختم نہ ہو۔ پہلا قول امام شافعی کا جدید قول ہے اور دوسرا قول امام شافعی کا قدیم قول ہے۔ فقہائے شافعیہ نے اس بارے میں وارد حدیث مسلم کی وجہ سے

---

(۴۴) رسالہ اعتقادیہ، ص ۲۵۳۔

* "عورۃ" یعنی مرد وعورت کے لئے جسم کے جن حصوں کو ڈھانکنا چاہئے۔

(۴۵) متن الغایۃ والتقریب، ص: ۳۱۔

(۴۶) الإقناع في حل ألفاظ أبي شجاع، ج: ۱، ص: ۲۲۷۔

دوسرے قول پر ہی اعتماد کیا ہے۔[۴۷]

فصل: نماز کے شرائط و ارکان کے بیان میں: علم فقہ سے متعلق رسالہ کی دسویں فصل کو حضرت امیر رحمہ اللہ نے نماز کے شرائط اور ارکان کے بیان کے لیے مختص کیا ہے۔ شرائط نماز میں آپ نے چار شرائط کو ذکر کیا ہے اور پھر ان کی تفصیل شافعی فقہ کے مطابق بیان فرمائی ہے: اول: ستر عورہ جس میں آپ نے مرد، آزاد عورت اور لونڈی کے ستر کے احکام کو بیان کیا ہے۔ دوم: طہارت مکان، سوم: دخول وقت اور چہارم: استقبال قبلہ۔ اس کے بعد آپ نے نماز کے ارکان، جنہیں "فرائض نماز" بھی کہا جاتا ہے، پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ نماز کے ارکان بیان کرنے میں فقہا کا عام طرز عمل یہ ہے کہ وہ نماز کی رکعات کی تعداد سے قطع نظر اس کے تمام ارکان کا یک بار ذکر کرتے ہیں۔ حضرت امیر کبیر رحمہ اللہ نے اس سے قدرے مختلف طریقہ اختیار کرتے ہوئے نماز کے ارکان کو نماز کی رکعات کی تعداد کے حساب سے ذکر کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ دو رکعات نماز میں تینتیس چیزیں فرض ہیں۔ اس کے بعد آپ نے پہلی رکعات کے چودہ اور دوسری رکعات کے بارہ ارکان کو ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فقہا کے عام طریقے سے ہٹ کر تشہد کو بھی سات اجزاء میں تقسیم کر کے اسے سات ارکان پر مشتمل قرار دیا ہے اور اس طرح دو رکعات نماز میں ارکان کی تعداد کو تینتیس تک پہنچا دیا ہے[۴۸]۔ یہاں پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگرچہ آپ نے ایک رکن کو دو بار شمار کر کے ارکان کی تعداد کو بڑھایا ہے تاہم یہ تمام ارکان الصلاۃ وہی ہیں جو شافعی مذہب میں ارکان الصلاۃ شمار کئے جاتے ہیں۔ حضرت امیر رحمہ اللہ کا یہ طرز عمل ایک تعلیمی عمل ہے جس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ امام خطیب شربینی شافعی رحمہ اللہ ارکان کی اسی بحث کے ضمن میں فرماتے ہیں: "علما کے درمیان (تعداد ارکان کا اس طرح کا) اختلاف لفظی ہے"۔[۴۹]

---

[۴۷] محمد الزهري الغمراوي، أنوار السالك شرح عمدة السالك وعدة الناسك، دار نور الصباح، مدیات، ترکیا، ۲۰۱۱م، ص: ۷۸۔

[۴۸] رسالہ اعتقادیہ، ص ۲۵۴-۲۵۵۔

[۴۹] الإقناع في حل ألفاظ أبي شجاع، ج: ۱، ص ۲۶۲۔

فصل کے اختتام پر آپ نے درود ابراہیمی کے انہیں الفاظ کو اختیار فرمایا ہے جو سیدنا عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں[۵۰] اور جیسا کہ معلوم ہے تشہد کے یہی الفاظ سادات شافعیہ کے یہاں زیادہ پسندیدہ ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول تشہد کے بارے میں فرماتے ہیں: "فكان هذا أحبها إليّ لأنه أكملها"[۵۱] (یہ ان میں سے مجھے سب سے زیادہ پسند ہے کیونکہ یہ ان میں سے سب سے زیادہ مکمل ہے)۔ اس کے علاوہ اس فصل میں حضرت امیر رحمہ اللہ نے اذان اور اقامت کا حکم بھی بیان کیا ہے جو آپ کے نزدیک سنت ہے[۵۲] جیسا کہ سادات شافعیہ کا مذہب ہے۔[۵۳]

فصل: نماز کی سنتوں کے بیان میں: رسالۂ اعتقادیہ کی گیارہویں فصل نماز کی سنتوں کے بیان کے لیے مخصوص ہے۔ حضرت امیر رحمہ اللہ نے نماز کی سنن کو بیان کرنے میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو نماز کے ارکان کو بیان کرنے میں آپ نے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں کہ نماز کی دو رکعات میں باسٹھ سنتیں ہیں۔ پہلی رکعات میں آپ نے اٹھائیس اور دوسری میں بائیس سنتیں ذکر کیں ہیں۔ اسی طرح تشہد کی دس سنتوں کا بھی آپ نے ذکر کیا ہے۔[۵۴]

واضح رہے کہ سادات شافعیہ کے یہاں نماز کی سنتیں دو طرح کی ہیں: ایک وہ جن کے چھوٹنے سے سجدۂ سہو کرنا سنت ہے اور دوسری وہ ہیں جن کے چھوٹنے سے سجدۂ سہو نہیں کیا جاتا۔ اول الذکر سنتوں کو سنن الأبعاض اور ثانی الذکر سنتوں کو سنن الهيئات کہا جاتا ہے[۵۵]۔ حضرت امیر رحمہ اللہ نے اس فصل میں صرف سنن الهيئات کے ذکر پر ہی اکتفاء کیا ہے۔

---

(۵۰) رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۵۵۔

(۵۱) محمد بن إدريس الشافعي، الأم، دار ابن حزم، بیروت، ۲۰۱۱م، ج: ۲، ص ۲۶۹۔

(۵۲) رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۵۲۔

(۵۳) متن الغاية والتقريب، ص ۳۵۔

(۵۴) رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۵۵-۲۵۶۔

(۵۵) مغني المحتاج، ج: ۱، ص ۴۸۷۔

فصل: مبطلات نماز کے بیان میں: بارہویں فصل میں حضرت امیر رحمہ اللہ نے ان امور کو تفصیل سے بیان کیا ہے جن سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور جنہیں فقہی اصطلاح میں "مبطلات الصلاۃ" (نماز باطل کرنے والی چیزیں) کہا جاتا ہے۔ آپ نے اٹھارہ مبطلات کا ذکر کیا ہے جن میں سے پانچ وہ ہیں جن سے انسان کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ آپ نے بقیہ مبطلات میں ہنسنے، گریہ وزاری کرنے اور بے ضرورت کھانسنے کو بھی شامل کیا ہے (۵۶)۔ اس بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ شافعی مذہب میں فقہا کے صحیح ترین قول کے مطابق ان امور سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ ہاں اگر ان سے دو حروف ظاہر ہوں (*) تو اس صورت میں ان سے نماز کا ابطلان لازم آئے گا کیونکہ دریں صورت یہ کلام کے زمرے میں داخل ہوں گے اور کلام بذات خود مبطل الصلاۃ ہے۔ چنانچہ شافعی مذہب میں سند کا درجہ رکھنے والے عالم امام نووی رحمہ اللہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> اور شافعی فقہا کے صحیح قول کے مطابق کھنکھارنے، ہنسنے، رونے، کراہنے اور پھونک مارنے سے اگر دو حروف ظاہر ہو گئے تو نماز باطل ہو جائے گی اور اگر ظاہر نہیں ہوئے تو نماز باطل نہیں ہو گی۔ (۵۷)

امام خطیب شربینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "تبسم سے نماز باطل نہیں ہوتی"۔ (۵۸)

فصل: سجدۂ سہو کے بیان میں: تیرہویں فصل میں حضرت امیر رحمہ اللہ نے سجدۂ سہو کا حکم بیان کرنے کے ساتھ ان صورتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں ایک مسلمان کے لیے سجدۂ سہو کرنا سنت ہے۔ جیسا کہ نماز کی سنتوں میں سے سنن الأبعاض میں کسی طرح کا نقص یا خلل واقع ہونے کی صورت میں شوافع کے ہاں سجدۂ سہو سنت ہے اسی لیے حضرت امیر رحمہ اللہ نے اس فصل میں سنن الأبعاض کو بھی بیان فرمایا ہے۔ (۵۹)

---

(۵۶) رسالۂ اعتقادیہ، ص: ۲۵۷۔

(*) یعنی اگر دوران نماز زبان سے دو حروف بھی نکلیں تو نماز باطل ہو جائے گی۔

(۵۷) أبو زكريا يحيى بن شرف الدين النووي، منهاج الطالبين، دار الفيحاء، بيروت، ۲۰۲۲م، ص: ۱۰۱۔

(۵۸) مغني المحتاج، ج: ۱، ص ۶۳۰۔

(۵۹) رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۵۷۔

فصل: مسافر کے احکام کے بیان میں: حضرت امیر رحمہ اللہ نے چودھویں فصل کو سفر اور مسافر کے احکام کے لیے مختص کیا ہے۔ آپ نے اولاً اس فصل میں اس سفر کے بعض شروط کا ذکر کیا ہے جن میں مسافر کے لیے قصر اور جمع بین الصلاتین کی رخصتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ اس کے بعد آپ رحمہ اللہ نے قصر اور جمع بین الصلاتین کا طریقہ اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔[۶۰]

فصل: مکروہ اوقات و اماکن کے بیان میں: پندرھویں فصل میں حضرت امیر رحمہ اللہ نے ان اوقات اور جگہوں کا ذکر کیا ہے جن میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ آپ نے پہلے مکروہ جگہوں کو اور پھر مکروہ اوقات کو بیان فرمایا ہے۔ مکروہ اوقات میں آپ نے اختصار کے ساتھ صرف تین اوقات کا ذکر فرمایا ہے جبکہ شافعی مذہب میں مکروہ اوقات پانچ ہیں[۶۱]۔ آپ نے جن تین اوقات کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں: پہلا نماز صبح کے بعد آفتاب کے پوری طرح طلوع ہونے تک۔ دوسرا آفتاب کے ٹھیک سر پر کھڑا ہونے سے اس کے زائل ہونے تک اور تیسرا نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک[۶۲]۔ شافعی مذہب میں دو اور مکروہ اوقات یہ ہیں: ایک سورج کے طلوع ہوتے وقت یہاں تک کہ وہ ایک نیزے کے بقدر بلند ہو جائے اور دوسرا سورج کے غروب ہوتے وقت[۶۳]۔ آپ مزید فرماتے ہیں کہ ان اوقات میں وہ نماز پڑھنا مکروہ ہے جس کا کوئی سبب نہ ہو۔ رہی وہ نماز جس کا کوئی سبب ہو تو اسے ان اوقات میں ادا کرنا مکروہ نہیں ہے اور یہی سادات شافعیہ کا مذہب ہے[۶۴]۔ آخر میں اس بات کی وضاحت مناسب ہے کہ شافعی مذہب میں معتمد قول کے مطابق ان اوقات میں نماز ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔[۶۵]

---

[۶۰] ماخذ سابق، ص ۲۵۸۔

[۶۱] متن الغایۃ والتقریب، ص: ۴۰۔

[۶۲] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۵۸۔

[۶۳] متن الغایۃ والتقریب، ص: ۴۰۔

[۶۴] الإقناع في حل ألفاظ أبي شجاع، ج: ۱، ص: ۳۲۴۔

[۶۵] ماخذ سابق۔

فصل: نماز جمعہ کے احکام کے بیان میں: سولہویں فصل میں حضرت امیر رحمہ اللہ نے نماز جمعہ کے احکام ومسائل کو بیان فرمایا ہے۔ اس فصل میں پہلے آپ نے جمعہ کے وجوب اور اس کی صحت کی بعض شروط کو یکجا ذکر فرمانے کے بعد اس کے وقت کا بیان فرمایا ہے۔ آخر میں آپ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن پر جمعہ واجب نہیں۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں: "اور بچے، عورت، غلام، بیمار، مسافر اور صحرا نشین پر جمعہ واجب نہیں ہے۔"[۶۶]

فصل: نماز عید کے بیان میں: نماز جمعہ کے احکام کے بیان سے فراغت کے بعد آپ نے سترہویں فصل کو نماز عید کے احکام کے بیان کے لیے مختص کیا ہے۔ آپ اولاً فرماتے ہیں کہ یہ نماز سنت ہے[۶۷] جیسا کہ سادات شافعیہ کا مذہب ہے[۶۸]۔ اس کے بعد آپ نے نماز عید کے وقت کو بیان فرمایا ہے کہ اس کا وقت کہاں سے شروع ہو کر کہاں تک رہتا ہے۔ اس کے بعد اس نماز کی رکعات کی تعداد اور اس کے ادا کرنے کا طریقہ بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ دو رکعت ہے جن میں پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے بعد سات تکبیریں ہیں اور دوسری رکعت میں تکبیر قیام کے بعد پانچ تکبیریں ہیں[۶۹] جیسا کہ شوافع کا مذہب ہے[۷۰]۔ فصل کے اختتام پر آپ فرماتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ خطبۂ عید نماز عید کے بعد پڑھا جائے۔[۷۱]

فصل: نماز جنازہ کے بیان میں: اٹھارویں فصل میں حضرت امیر رحمہ اللہ نے نماز جنازہ کے احکام بیان فرمائے ہیں۔ سب سے پہلے آپ نے نماز جنازہ کا حکم بیان فرمایا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کی ادائیگی کا طریقہ بیان فرماتے ہوئے اس ماثور دعا کو بھی نقل کیا ہے جو نماز جنازہ میں پڑھی جاتی

---

[۶۶] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۵۸۔

[۶۷] ماخذ سابق۔

[۶۸] متن الغایۃ والتقریب، ص: ۴۳۔

[۶۹] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۵۸-۲۵۹۔

[۷۰] متن الغایۃ والتقریب، ص: ۴۳۔

[۷۱] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۵۹۔

ہے۔ آپ نے اختصار کے پیش نظر فقط ایک دعا کے بیان پر اکتفاء فرمایا ہے ورنہ اس سلسلے میں اور بھی ادعیہ نقل ہوئی ہیں جنہیں علما نے اپنی کتابوں میں ذکر فرمایا ہے۔ فصل کے آخر میں آپ نے نماز جنازہ کے فرائض کا ذکر فرمایا ہے[۷۲] اور وہ وہی ہیں جو شافعی فقہ میں مذکور ہیں۔[۷۳]

فصل: اسرار نماز کے بیان میں: فقہ سے متعلق یہ اس رسالے کی انیسویں اور مباحث نماز سے متعلق آخری فصل ہے۔ جیسا کہ ذکر گزرا، ایک صوفی بزرگ ہونے کی حیثیت سے آپ کی نظر اعمال کے ظاہر کے ساتھ ساتھ ان کے باطن پر بھی مرکوز رہتی ہے۔ نماز کے ظاہری احکام کے بیان کے بعد آپ نے اس فصل میں نماز کے اعمال کے اسرار و حکمتوں کو تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ نماز کے افعال میں سے ہر فعل اور اس کے ارکان میں سے ہر رکن ایک حقیقت اور اسرار عبودیت و ربوبیت کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے کئی افعال صلاۃ کے اسرار کو بیان فرمایا ہے۔ مثلاً رکوع کی حکمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ مقام رضا و خضوع کی طرف اشارہ ہے۔ سجدے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ تحقیق ذلت وانکسار اور اسقاط دعویٰ کی طرف اشارہ ہے۔[۷۴]

فصل: روزوں کے احکام کے بیان میں: مباحث نماز سے فراغت کے بعد اس بیسویں فصل کو حضرت امیر رحمہ اللہ نے روزوں کے احکام و مسائل کے بیان کے لیے مختص کیا ہے۔ سادات شافعیہ کے یہاں روزے کے تین ارکان ہیں جیسا کہ امام خطیب شربینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> روزے کے ارکان تین ہیں: روزے دار، نیت اور تمام مفطرات سے اپنے آپ کو روکے رکھنا۔[۷۵]

شوافع کے یہاں ارکان کے لیے فرائض اور واجبات کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ حضرت

---

(۷۲) رسالہ اعتقادیہ، ص ۲۵۹۔

(۷۳) الإقناع في حل ألفاظ أبي شجاع، ج: ۱، ص: ۴۲۳-۴۲۹۔

(۷۴) رسالہ اعتقادیہ، ص ۲۶۰۔

(۷۵) الإقناع في حل ألفاظ أبي شجاع، ج: ۱، ص: ۴۹۴۔

امیر رحمہ اللہ نے اس فصل میں نیت اور مفطرات سے امساک پر ہی کلام فرمایا ہے[۷۶]۔ اختصار کے پیش نظر آپ نے روزے دار پر کلام کرنے سے گریز کیا ہے۔ روزے دار سے مراد وہ شخص ہے جس پر ایک تو روزے فرض ہیں اور دوسرے جس کے روزے صحیح ہیں۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت امیر رحمہ اللہ نے رؤیت ہلال یا شعبان کے تیس دن مکمل ہونے سے رمضان کے روزے فرض ہونے کو واجبات میں شمار کیا ہے[۷۷]۔

روزے کے واجبات کے بعد آپ نے قضا اور کفارے کے بعض مسائل شافعی مذہب کے مطابق ذکر کرنے کے بعد روزے کی بعض سنتوں کا ذکر کیا ہے۔[۷۸]

فصل: روزوں کے احکام باطنی کے بیان میں: یہ رسالۂ اعتقادیہ کی آخری فصل ہے۔ اس فصل میں حضرت امیر رحمہ اللہ نے روزوں کے اسرار و حکم پر بڑے خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

> جان لو کہ روزے کے تین درجے ہیں: پہلا درجہ پیٹ اور شرمگاہ کی حفاظت کرنا ہے اور یہ سب سے کمتر درجہ ہے۔ دوسرا درجہ ناشائستہ افعال و اقوال سے جوارح کی حفاظت کرنا ہے اور تیسرا درجہ دل کی غیر اللہ سے حفاظت کرنا ہے۔[۷۹]

اس فصل کے ساتھ ہی رسالۂ اعتقادیہ کے مضامین مکمل ہو جاتے ہیں۔

نتائج بحث:

- حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمہ اللہ اہل سنت والجماعت کے عقیدے پر تھے اور اہل سنت کے عقائدی مدارس میں سے آپ کا تعلق مدرسۂ اشاعرہ کے ساتھ تھا۔
- آپ نے عقائد کے باب میں اس وقت کے رائج فلسفے کا رد کرتے ہوئے قرآن و سنت پر مبنی عقائد کا اثبات کیا۔

---

[۷۶] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۶۱۔

[۷۷] ماخذ سابق۔

[۷۸] رسالۂ اعتقادیہ، ص ۲۶۱۔

[۷۹] ماخذ سابق۔

- فقہ میں آپ کا تعلق شافعی مذہب سے تھا اور آپ نے اپنی کتابوں میں مسائل کو شافعی مذہب کے مطابق بیان فرمایا ہے اور رسالۂ اعتقادیہ اس بات کی سب سے بڑی شہادت اور اس امر کا بین ثبوت ہے۔
- آپ نے رسالۂ اعتقادیہ کو بطور ایک متن کے تحریر فرمایا ہے اور اختصار کے پیش نظر تمام فصول میں بہت سارے مسائل کو بیان کرنے سے گریز کیا ہے جیسا کہ عمومی طور پر متون کا معاملہ ہوتا ہے۔
- چند ایک مسائل کو چھوڑ کر، جن کی تعداد بہت قلیل ہے، آپ نے تمام مسائل کو شافعی مذہب کے معتمد قول کے مطابق ذکر کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شافعی مذہب پر آپ کی گہری نظر تھی۔ رہے وہ چند مسائل جن میں آپ نے مذہب کے معتمد قول کے بجائے ضعیف قول کو اختیار کیا ہے تو اس میں عین ممکن ہے کہ آپ کے نزدیک وہی مسئلہ راجح ہو۔
- آپ نے فقہی مسائل کے پہلو بہ پہلو ان کے اسرار اور حکمتوں کو بھی اجاگر فرمایا ہے۔ یہ آپ کے صوفی ہونے کی وجہ سے بھی ہے اور آپ پر امام غزالی رحمہ اللہ کے گہرے اثرات کے سبب سے بھی۔
- علم الکلام اور فقہ دونوں میں آپ کے فکر و نظر پر امام غزالی رحمہ اللہ کے نمایاں اثرات ہیں اور آپ نے امام صاحب کی کتابوں پر کافی انحصار فرمایا ہے اور ان سے خوب استفادہ کیا ہے۔
- آپ مسلکاً شافعی تھے مگر کشمیر میں، جہاں کے لوگ آپ کی مساعیٔ جمیلہ کی وجہ سے اسلام کے نور سے روشناس ہو کر جہالت کے اندھیروں سے نکل کر مشرف بہ اسلام ہوئے، آپ شافعی مسلک کی ترویج سے باز رہے کیونکہ یہاں کے لوگ پہلے ہی حنفی مسلک سے متعارف ہو چکے تھے اور نئے نئے ہی مسلمان ہوئے تھے۔ یہ آپ کی وسعت فکر و نظر اور آفاقی سوچ کی روشن دلیل ہے۔

وفیات

آہ! مولانا شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی ندوی مرحوم

(۱۹۴۷ء-۲۰۲۵ء)

محمد عمیر الصدیق ندوی

شعبان المعظم کے آخری دن تھے۔ عیسوی لحاظ سے ۲۷ر فروری کی تاریخ تھی۔ خبر آئی کہ رفاعی صاحب رحمتوں کے دن شروع ہونے سے پہلے ہی رحمت حق سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

بنگلور کرناٹک کی ایک بستی ڈوڈابالاپور میں وہ پیدا ہوئے لیکن اصل نسبت جیلان ہی کی پائی۔ بارہ اگست ۱۹۴۷ء تاریخ پیدائش ہے۔ یعنی ایک ملک کے قیام ووجود اور ایک اور ملک کی آزادی وخود مختاری کے ماحول میں انہوں نے دنیا پر نظر کی اور زندگی بھر وہ اسی وجود اور آزادی کی تصویر وتعبیر بنے رہے۔

ان کا نام عموماً مولانا شاہ سید مصطفیٰ جیلانی قادری رفاعی ندوی جیسے القاب اور نسبتوں کے ساتھ لیا اور لکھا جاتا رہا مگر وہ اپنے چھوٹوں سے رفاعی بھائی کے الفاظ تخاطب پر زیادہ مسرور نظر آتے۔ جیلانی، رفاعی اور ندوی کی نسبتوں کے اجتماع نے ان کی شخصیت میں وہ رنگ بھر دیا تھا جس کو دیکھ کر ان ہستیوں کی یاد آجاتی تھی جن کو ظاہر وباطن، علم ومعرفت اور شریعت وطریقت کا مجمع البحرین سمجھا جاتا ہے۔

سید عبدالرزاق بن سید عبدالقادر جیلانیؒ سے نسبی اور سید احمد کبیر رفاعیؒ سے باطنی تعلق کے امتزاج کی تہہ میں جو اسرار پنہاں ہیں، رفاعی صاحب نے غالباً پہلی بار اردو میں ان کو ظاہر اور عام کیا اور یہ کارنامہ انہوں نے ندوہ کے طالب علم کی حیثیت سے نوعمری میں انجام دیا۔ درجہ فضیلت میں مقالہ لکھنے کے لئے انہوں نے سید احمد کبیر رفاعی کی شخصیت کو موضوع بنایا اور یہی مقالہ ہندوستان میں سلسلہ رفاعیہ کے عمومی اور بنیادی تعارف کا سبب بنا۔ جنوبی ہند کے ایک غیر اردو علاقہ کے چوبیس پچیس سالہ نوجوان طالب علم کی اس کاوش کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جس طرح نظر تحسین سے دیکھا اس کو فیضان نظر اور مکتب کی کرامت دونوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، مولانا

ندویؒ نے لکھا کہ ”ریاست کرناٹک پہلے بھی اپنے پھولوں اور خوشبودار سامان اور مشام نوازی کے لیے مشہور تھی، اب یہ ایک نیاجاں نواز اور عطر بیز جھونکا اس طرف سے آیا ہے۔“

رفاعی مرحوم کو قریب سے جاننے والے ان کی ظاہری ہیئت کے تغیر زمانی وروحانی کا ذکر ضرور کرتے ہیں کہ جب وہ ۱۹۶۵ء میں ندوہ میں داخل ہوئے تو حلیہ مغربی رنگ کا تھا، طور طریق میں بھی اسلوب جدید کی تقلید تھی، لیکن ۱۹۷۲ء میں جب وہ فارغ ہوئے تو وہ بقول صوفی عبد الرب ”ہر چند کہ ابھی نوعمر ہیں لیکن علم وفضل کے محاسن سے آراستہ ہیں، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مسترشد و مرید و محبوب اور مجاز ہیں اور اپنے دوام طاعت وذکر اور مشغلہ علم وفضل کے سبب برابر جادۂ ترقی پر گامزن ہیں۔“

دل کی دنیا کے زیر زبر ہونے کے واقعات اکثر پڑھے تو جاتے ہیں، دیکھے نہیں جاتے مگر خوش پوش اور مقبول عام لباسی چلن کے دلدادہ نوجوان کو قلندرانہ سیہ پوشی میں دیکھنا بہر حال واقعہ ہے، لانباسیاہ کرتا، سیاہ تہبند، سیاہ چادر میں ملبوس ان کا چہرہ بلکہ ان کا جسمانی وجود، سیاہ بدلیوں میں چھپتے چھپاتے چاند کو تخیل میں لا دیتا۔ یہی سیہ پوشی ان کے شعار اور ان کی شناخت میں ایسی بدلی کہ سفر، حضر ہر محل و مستقر پر وہ اعلان کرتی رہی کہ شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے ساتھ۔

سفر کا ذکر آیا تو کہنا چاہیے کہ رفاعی صاحب کی ساری زندگی سفر کا دوسرا نام ہوگئی۔ سلسلۂ رفاعیہ کی ترویج، علمی و ادبی مجلسوں میں شرکت، تعلیمی اداروں کی نگہداشت، سماجی خدمات کی فکر اور معاشی اور سیاسی سرگرمیوں میں شمولیت نے ان کے لیے زمینی فاصلوں کی تعبیر ہی کو بے معنی بنا دیا۔ صوفیہ کی روایات میں جہاں گشتی کا ایک مقام ہے۔ رفاعی صاحب اس مقام سے بھی سرفرازانہ گزر گئے۔ اگرچہ اس راہ میں کئی مرحلے بڑے سخت بھی آئے، مسلم پرسنل لا بورڈ، ملی کونسل، یونی ورسل پیس فاؤنڈیشن، انٹرنیشنل لیگ آف اسلامک لٹریچر کا شمار ان ہی مرحلوں میں ہے، جہاں ان کے اصل ذوق ونظر اور مذاق و مزاج کی آزمائشیں تھیں مگر ان کی قلندرانہ شان نے ہمیشہ ان کی آبروئی اور سرخ روئی میں اضافہ ہی کیا۔ وہ اپنے طریق سے الگ ان راہوں پر بے نیازانہ گزرے ان کے اس شان بے نیازی کا مظہر ان کی مرتبہ چند کتابیں جیسے مخزن، شہ پارے، ماحصل، حاصل مطالعہ، خزینہ، گنجینہ، ماحضر وغیرہ ہیں، ان کو انہوں نے فقیر کے کشکول سے یہ کہہ کر تعبیر کیا کہ اس فقیر نے بجائے اس کے کہ خود مختلف عنوانات و موضوعات پر مضامین لکھے، دیگر اہل قلم کی کاوشوں

سے قارئین کو مستفید کرانا مناسب سمجھا۔

فائدہ اٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی یہی سوچ ان کی زندگی کا حاصل بن گئی، انہوں نے اگرچہ خود بھی مختلف موضوعات پر قلم سے قارئین کی رہنمائی کی مگر سوچ اسی افادۂ عام کی غالب رہی۔ ان کی تحریر خود بھی بڑی پختہ تھی، لکھنؤ کے دس بارہ سال قیام نے ادبی رنگ سے بھی نوازا تھا، مخزن کے اپنے مقدمہ کو انہوں نے فقیرانہ کلام، کی سرخی دی۔ فقیرانہ کلام کی برکت تھی کہ تصنیفات و تالیفات کی تعداد پچیس سے بھی زیادہ ہوگئی، اس فقیرانہ تونگری کا فقط ایک ہی منشا و مقصود رہا کہ قارئین کو حالات و حقائق سے باخبر رکھا جائے۔ اس جذبہ کے متعلق صحیح کہا گیا کہ رفاعی صاحب نے خدمت خلق اور رضائے خالق کا نیا راستہ تلاش کیا اور وہ ہے علماء اور عصری تعلیم یافتہ اہل قلم کے مفید مضامین کو مجموعوں کی شکل میں محفوظ کرنا اور ان سے استفادے کو آسان بنایا جائے۔

رفاعی صاحب کی ہمہ گیری میں ان کی گوشہ گیری کی صفت بہر حال اپنا جلوہ دکھاتی رہی۔ وہ اپنے مسلک رفاعیہ اور نسبت قادریہ کے مذاق عارفانہ اور اس راہ کی دعوت اصلاح و ارشاد سے بھی ذرا غافل نہیں رہے۔ خانقاہ قادریہ رفاعیہ کے زیب سجادہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے عملی اور علمی دونوں لحاظ سے اپنا حق ادا کیا۔ صوفیہ و تصوف، ارشادات حضرت رفاعی، رموز رفاعیہ، مجالس رفاعیہ، اولیاء اللہ کا حال، زیارت قبور اور ایصال ثواب، مسائل حج و عمرہ و زیارت وغیرہ کتابیں اسی حق کی علامتیں اور شہادتیں ہیں۔ عربی اور انگریزی میں بھی ان کی کتابیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ اقوال و احوال و اعمال سلف کی خود زندہ داستان تھے اور اس داستان کا مرکزی نقطہ ان کے ان شعروں میں ظاہر ہو گیا کہ:

معرفت کی اور طریقت کی حقیقت کو دکھا　　طاعت شرع محمدؐ پر ہمیں مامور کر
کھول دے ابواب کو اسرار باطن کے تمام　　گنج عرفاں سے ہمارے سینوں کو معمور کر

ان کے علوم ظاہری اور اسرار باطنی کی اصل قدر تو واقعی اسی کوچے سے گزرنے والوں کو ہوگی، ہمارے لیے تو وہ محبت، اخلاق، والہانہ تعلق اور بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت کا ایسا پیکر تھے جس کو یاد رکھنا اور بھلا دینا دونوں آسان نہیں۔ ان کے لہجہ کی معصومیت اور ان کی نگاہوں کی ملائمت کوئی بھلا بھی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان کو اس دنیا میں مدارج عالیہ سے نوازا، یقین ہے کہ اس کی رحمت اپنے قرب میں رفاعی بھائی کو بلند سے بلند تر درجات سے نوازتی رہے گی۔

بابـــ التقریظ والانتقاد

اردو رسائل کے خاص شمارے اور نئے رسائل

محمد عمیر الصدیق ندوی

اردو کے رسائل پر عجب وقت آن پڑا ہے، چند سال پہلے جن رسالوں کی نگاہیں عادی تھیں، زیادہ تر وہ اب نظروں سے اوجھل ہیں۔ اشاعت یا اس کے تسلسل یا مصارف اشاعت اور ترسیل کے روزافزوں اخراجات ومسائل نے ان رسائل کو عدم ووجود کے مراحل سے دوچار کررکھا ہے۔ ایسے میں غنیمت ہے کہ بعض رسالے زندہ رہنے کی جدوجہد کے ساتھ قوت وتوانائی کا احساس دلاجاتے ہیں۔ ان میں کچھ خاص شمارے ہمارے سامنے ہیں جو اسی احساس کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان میں رسالہ جامعہ کا میر تقی میر نمبر' مجلہ ارمغان کا میر نمبر، اردو ادب کا میر نمبر، اردو ادب ہی کا املا نمبر، دستک کا اردو صحافت اور ہندی ادب نمبر، نقوش طیبات کا رحمۃ للعالمین نمبر، مجلہ شیخ العالم کا حضور صابر پاک نمبر وغیرہ ہیں۔ ان خاص نمبروں کے علاوہ رسالہ میر اپیام، بازیافت اور صدائے جوہر بھی ہیں۔ معارف کے صفحات میں ان کا ذکر وقت پر آنا چاہیے۔ لیکن بوجوہ اس فریضے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ سر دست یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دو رسالوں، جامعہ اور ارمغان کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ جامعہ کے میر تقی میر نمبر کی پہلی جلد کی قیمت ۳۰۰ روپے ہے۔ پروفیسر شہپر رسول کی ادارت میں اس رسالہ کا پتہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵ ہے۔ ای میل اس طرح ہے:zhis@jmi.ac.in اور مجلہ ارمغان زیرادارت پروفیسر احمد محفوظ کا پتہ ہے: شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، مولانا محمد علی جوہر مارگ، جامعہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔ ای میل یہ ہے: urdu@jmi.ac.in قیمت درج نہیں۔ دونوں خاص شمارے متوسط کتابی تقطیع پر ہیں، غیر مجلد ہیں مگر طباعت اور کاغذ دونوں میر تقی میر کے شایان شان ہیں۔

میر تقی میر نے تین سو سال پہلے اردو شاعری کی دنیا میں شہ شاعراں اور آخر میں خدائے سخن کا جو مرتبہ ومقام حاصل کیا، اس کے انکار کی جرأت اردو کی شعری شریعت میں کسی اور مدعی سخن کو

نہیں ہوسکی۔ خود میر صاحب کو احساس ہی نہیں یقین تھا کہ میر کا سمجھنا اس لیے سہل نہیں کہ اس کی ہر بات ایک مقام سے ہے۔ مقام کی بلندی اس کی گہرائی کے تناسب سے ہو تو واقعی یہ ناقابل تسخیر بن جاتی ہے۔ میر کی اسی ناقابل تسخیر خوبی نے ان کو میر سے جہاں گیر بنادیا۔ غالب و اقبال جیسے زمان و مکاں سے ماوراء شعراء کی موجودگی میں اگر جہان اردو میں میر کی شاہی و خدائی قائم رہی تو اس کی وجہ صاف ہے کہ میر کے جذبے، ہر دور کے جذبوں سے قریب تر اور ہم آہنگ بنتے رہے۔ میر کی یاد اسی لیے خوب ہے اور اس سے باز نہیں آیا جاسکتا کہ وہ بھلائے ہی نہیں جاسکتے۔ اسی حقیقت کا اظہار قریب دو برس پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جشن میر کو منعقد کرکے کیا۔ زیر نظر دونوں خاص شمارے غالباً اسی جشن کے چمن میں غنچۂ پژمردہ کے کھلنے کا اعلان ہیں۔ جامعہ ملیہ کے رسالہ جامعہ کی خصوصیات میں معیار کی بلندی کی صفت ہمیشہ موجود رہی۔ اس کا ایک اندازہ اس کے خصوصی شماروں سے کیا جاسکتا ہے جن کے متعلق زیر نظر شمارے کے اداریے میں بجا طور پر کہا گیا کہ رسالہ جامعہ نے اپنے باکمالوں کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ سچائی بھی یہی ہے کہ یاد کیے جانے سے زیادہ فراموش نہ کیا جانا، زیادہ اہم ہے۔ ماضی قریب سے قوم کے ساتھ زبان و ادب پر بھی مصائب کی ایک لہو رنگ یلغار ہے، جور گردوں سے میر صاحب کا جگر بھی شاید اسی طرح خوں ہوا ہوگا۔ پراگندگیٔ طبع کے ساتھ پراگندگیٔ رزق کی تصویر میر کے آئینہ خانہ سے زیادہ اور کہاں دیکھی جاسکتی ہے۔ شاید اسی احساس نے اس جشن میر کو ایک روایت سے زیادہ ایک ایسی ضرورت میں بدل دیا جہاں اس شکوہ کو بار بار دہرانے کا بہانہ مل جاتا ہے کہ:

تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں　　وجہ بیگانگی نہیں معلوم

ہمارے سامنے رسالہ جامعہ کا وہ میر تقی میر نمبر ہے جس کو جلد اول بھی بتایا گیا ہے۔ یہ جلد اول دراصل میر کے مطالعہ میں بنیادی، جامع اور وقیع ترین مضامین کا انتخاب بلکہ حسن انتخاب ہے۔ منشی محمد حسین آزاد سے قاضی جمال حسین تک ان تمام اہم تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی تحریریں آگئی جن کو کسی نہ کسی شکل میں میر سے صحبت رہی ہے، میر کے دین و مذہب کے فاروقی مبلغین کے علاوہ، آل احمد سرور، سید محی الدین زور، ناصر کاظمی، حسن عسکری، شمیم حنفی، عبد المغنی اور علی احمد فاطمی وغیرہ کی تحریروں نے اس شمارے کو واقعی خاص بنادیا۔ آزاد کی آب حیات اب صرف کلاسک کے طور پر طالب علموں کے نصاب میں ہے لیکن اردو کی لطافت و حلاوت کا حساب کرنے میں تقاضا یہی ہے کہ

اس کے الفاظ و حروف کی سبحہ شماری، ہر روز کا وظیفہ بن جائے، کیسے کیسے ایسے جملے نگاہوں کی چمک بڑھا دیتے ہیں کہ "میر کی غزلیں ہر بحر میں کہیں شربت اور شیر و شکر ہیں مگر چھوٹی چھوٹی بحروں میں فقط آب حیات بہاتے ہیں"۔ میر نے برسات کی شکایت کے عنوان سے مثنوی لکھی، آزاد نے کہا کہ "اگر خیال کرو تو شاعر کی شورش طبع کے لیے یہ بھی موقع خوب تھا مگر طبیعت مکان سے بھی پہلے گری ہوئی تھی۔ وہ یہاں بھی نہیں ابھری، سودا ہوتے تو طوفان اٹھاتے"۔ ایسے ہی یہ جملہ کہ "وہ غم و درد کا پتلا نہیں حسرت واندوہ کا جنازہ تھا"۔ منشی حسین آزاد کی روایت میں کیسی ہی بے مہاری ہو وہ نقد و جرح سے اسی لیے آزاد ہیں کہ نفس مضمون میں نہ کذب ہے نہ جراحت جیسے زبان میر سے اس جملہ کی نسبت کہ "شاعری دل خراشی و جگر سوزی کا کام ہے"۔ میر کی بے دماغیوں کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے مگر اس مضمون نے بتلایا کہ یہی بے دماغیاں میر کے جوہر کمال پر زیور بن جاتی ہیں، خوش نصیب تھے کہ آج کا زمانہ نہ دیکھا۔ ولی دکنی کو "بنی نوع شعراء کے آدم" سے تعبیر کرنا یہ صرف آزاد ہی کے قلم کا اعجاز ہو سکتا ہے۔

حق یہ ہے کہ ادارتی سلیقہ نے آزاد کے اس ابتدائی مضمون کی شمولیت سے باقی ہر تحریر کو پڑھنے کا شوق بڑھا دیا۔ میر معدودے ان چند اصحاب کمال میں ہیں جن کی زندگی کی داستان میں ان کی شاعری کی طرح ہر حکایت، ایک قصہ دل خراش و جگر سوز ہے۔ شاید اسی لیے نامور معتقدین میر نے ان کی داخلی، خارجی، سیرت اور بنیادی احوال و تصورات پر زیادہ محنت کی۔ اس شمارے میں یہ خوبی زیادہ واضح ہے اور یہ ایک شعوری خواہش کا بھی پتا دیتی ہے۔ ہر مضمون کا اپنا رنگ ہے لیکن دل پر خوں کی اک گلابی کبھی عرصہ دراز تک مخموری کی کیفیت کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ نہیں معلوم کہ میر کی شاعری کی معنی خیزی اور سحر آفریں تاثیر کب تک جاری و ساری رہے۔ اگر یہ پیشین گوئی ہے تو اس خاص تاثر کو ایک مہر اثبات ہی سمجھنا چاہیے۔ مضامین کی مسرت و افادیت کے لیے آزاد و سرور اور دہلوی فاروقیوں (خواجہ احمد و نثار احمد) کے نام کافی ہیں۔ شمس الرحمٰن کی فاروقیت کچھ اور وضع و وطیرہ کے حرف و حکایت سے اپنی پہچان کا اعلان کرتی ہے۔ ان کی منطق ہی اور ہے جیسے یہ کہ غالب نے میر سے بار بار استفادہ کیا ہے اور یہ دلیل اس بات کی ہے کہ غالب اور میر ایک ہی طرح کے شاعر تھے۔ مگر معاً بعد یہ جملہ بھی اسی منطق کا حصہ بن جاتا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کا اسلوب میر سے مستعار ہے۔ شک و ارتیاب کی یہی عادت آگے اس طرح سامنے آتی

ہے کہ غالب اور میر کا وہی معاملہ ہے جو مثلاً ازرا پاؤنڈ اور وسط لاطینی شعراء کا تھا۔ اب اردو کا قاری یہاں حاشیوں کا محتاج ہو جاتا ہے کہ جن سے مشابہت دی جاتی ہے آخر وہ ہیں کون؟ اور جب یہ بات سامنے آتی ہے کہ میر کے کلام سے ان کا نظریہ شعر تو بر آمد ہو سکتا ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ خود ان کا کلام اس نظریہ پر پورا اترتا ہے۔ یہیں آکر اس خاص نمبر کے عام قاری کو پتا چل جاتا ہے کہ تخلیقی تنقید اور اکتسابی تنقید میں فرق کیا ہے؟ آگے شمیم حنفی نے قاری کی یہ مشکل بھی آسان کر دی جب انہوں نے کہا کہ ایسی بحث میر اور غالب کی کسی قدر دوراز کار تعبیر ہے۔ شاید ان دوراز کار تعبیروں کی خشکی دور کرنے کے لیے قاضی جمال وافضال حسین کے ذوق جمالیات سے رعنائی کو درآمد کیا گیا۔ دیکھا جائے تو یہ ساری کاوشیں مدیرانہ سلیقہ وشعور کی رہین منت ہیں، اس کے لیے فاضل مدیر ڈاکٹر شہپر رسول اور ان کا تمام جہانِ جامعہ قدر اور تحسین و آفرین کا سزاوار ہے۔

جامعہ ہی کے شعبۂ اردو کا ایک باوقار مجلہ ارمغان کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ ارمغان نے بھی میر کی یاد اور تلاش کو ایک عظیم ثقافتی اور تہذیبی قوم وزبان کے اسباب عروج وزوال میں بدلنے کی کوشش کی اور نتیجے میں رسالہ جامعہ کے تین سو باون صفحات کے مقابلے میں پانسو اٹھاون صفحات کا یہ شمارہ شائع کر کے اپنی محنت پر ایک اور مہر استناد ثبت کر دی۔

ارمغان میں ایسے مضمون نگار زیادہ ہیں جو جامعہ میں نہیں تھے اور جو تھے ان کے بھی مضامین میں تکرار کی بو نہیں ہے۔ قاضی عبدالودود، مجنوں اور فراق گورکھپوری، گوپی چند اور تحسین کے ساتھ جدید نسل کے چند نمایاں نقادوں کی شمولیت نے دونوں خاص شماروں کی افادیت کو یکساں و مشترک ہونے کے نقص سے محفوظ کر دیا اور شاید اس میں مدیر احمد محفوظ کے نام کا اثر ہو جنہوں نے اداریہ میں تو کم لیکن میر کو پڑھنے کے لیے ایک الگ ہدایت نامہ قسم کے مضمون میں اپنے وجود کا اعلان کیا ہے کہ میر کا کلام جس طرز اظہار کا حاصل ہے اسے نام نہاد سادگی اور سلاست وغیرہ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظر میں میر کا عام، سطحی اور سرسری مطالعہ ہی دراصل میر کے حقیقی مطالعہ کی راہ میں حائل رہا ہے۔ اس عام، سطحی اور سرسری مطالعہ کی نشاندہی کے لیے احمد محفوظ نے بھی آب حیات کی جرعہ کشی کی اور بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آب حیات سے ہماری قدیم شعری روایت، جیتی جاگتی اور بھرپور صورت میں سامنے آتی ہے۔ یہ جملے بطور مقدمے کے ہیں ورنہ بعد میں عصر حاضر کی تنقیدی دانش کے اثرات کا غلبہ اتنا ہوا کہ بحث اس فقیرانہ دعا میں بدل گئی کہ بھلا ہو سب سے بڑے شعر شناس اور میر کے عارف شمس الرحمٰن فاروقی کا کہ انہوں نے کلاسیکی غزل

کی شعریات کو سمجھنے کی ضرورت کا احساس پیدا کر دیا۔ اس موقع پر پروفیسر عبدالحق کی یہ نصیحت سامنے آجاتی ہے کہ میر کے قد و قامت کے ساتھ انداز گفتگو اور طرز کلام میں درآئے الفاظ اور ان کے زیر و بم پر نظر رکھی جائے۔ لفظوں کے انتخاب یا استعمال سے رسوائی ہو یا نہ ہو فن اور قلم کار کی کسی حد تک شناخت ضرور ہو جاتی ہے۔ ارمغان کا یہ خاص نمبر اس ضرورت کی اہمیت کا اقرار کرا دیتا ہے، فاروقی (شمس) کے ساتھ فراق بھی یہاں موجود ہیں، جمع بین الفریقین کا نظارہ، دلچسپ ہی ہوتا ہے۔ فراق نے سوال قائم کیا کہ شعر میں نہ ایہام نہ ابہام، پھر دل اس کی جانب کھنچتا ہے؟ فراق نے یہ سوال میر ہی کے ایک شعر سے لیا۔ فراق نے جواب بھی خود ہی دیا کہ درد دل لاکھوں جمع کرنے اور ایہام سے دور رہنے والی خوبیاں تو خود میر ہی بتلا گئے اور اس طرح کہ غالب، آتش، انیس اور اقبال بھی یہ کہنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اس کے بعد فراق نے جو کہا تعجب ہے کہ اس پر پھر کبھی بات آگے نہ بڑھ سکی۔ کلام میر کو مانوس ترین معنوں میں فراق کے نزدیک جو عالم گیر شہرت ملی، ان معنوں کو نامانوس کیوں سمجھا گیا۔ فراق کے اس مضمون کی اس نمبر میں اشاعت اسی سوال کے لیے اس لیے اچھا شگون ہے کہ اس میں غزلوں کے علاوہ میر کے کلام میں غیر انسانی مخلوق کے ذکر کو جو اہمیت بعض نقادوں نے دی، اس سے میر کے ساتھ خود ان نقادوں کے ذوق نظر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جیسے یہی کہ ان جانوروں اور چیزوں سے ثابت کیا گیا کہ میر نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہ تازہ الفاظ استعمال کیے جس سے ان کے سرمایہ میں اشیا کی فراوانی ثابت ہوتی ہے اور اسی سے کثرت معانی کی وہ خوبی بھی ملتی ہے جس میں استعاراتی رنگ اور کثرت استعمال سے علامتی رنگ بھی شامل ہو جاتا ہے مثلاً توپ لفظ میں انگریزی حکومت کے اقتدار کا استعارہ ہے اور علامت بھی۔ مگر الفاظ کی کثرت میں اژدر نامہ کا اژدر اسی نقد کی نظر میں میر کی بدمذاقی اور ان کی حس مزاح کی کمی کا پکا نہیں تو خام نمونہ بن جاتا ہے اور اس کے بعد یہ جملہ میر کے جاننے والوں کے لیے ایک حیرت انگیز انکشاف بن جاتا ہے کہ میر کی حس مزاح غالب سے بھی بڑھ کر تھی یعنی اس نمبر کے مضامین بھی جامعہ کے نمبر کی طرح میریات کے مطالعہ کے لیے کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ دونوں نمبروں میں پھر فرق مراتب کیا ہے؟ اس کا آسان جواب تو شاید یہی ہے کہ جو فرق شہپر رسول اور احمد محفوظ میں ہے اور جسے جامعہ والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ عرصہ بعد میر تقی میر کے مطالعہ کی لذت کے ساتھ میر کے پر آشوب دور کی سچائیاں بھی زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھ میں آتی ہیں کہ موجودہ عصر، میر کے عصر سے زیادہ مختلف نہیں۔

تبصرۂ کتب

ڈاکٹر شمس بدایونی، رموزِ اوقاف کب، کہاں اور کیوں؟: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۲۱۸، قیمت: ۳۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر ۲۱۲، راؤز ایوینیو، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲، ای میل farooqi@yahoo.com

اردو تحریر میں علامات، مخففات اور اوقاف سے واقفیت قریب ہر قاری کو ہے۔ لیکن اس کو اور خود لکھنے والے کو ان نشانیوں کی تاریخ اور ان کے مطلب و منشا کا اتنا بھی علم نہیں جتنا ایک سڑک کے دورویہ نشانوں سے گاڑی چلانے والے کو ہوتا ہے۔ یہی حال مخففات کا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی حکومت و انتظامیہ کے مخففات کی اصل توجیہ سے قاصر نظر آتے ہیں۔ یہ وبا عام ہے لیکن اس سے ناواقفیت کے لیے جواز کا امکان تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب نے بظاہر غیر اہم نظر آنے والے موضوع کی اہمیت و ضرورت کو جس طرح محسوس کیا وہ یقیناً تعریف کے لائق ہے۔ کتاب کے فاضل مصنف اپنے ذوقِ تحقیق کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے دائرۂ تحقیق میں غالب و شبلی و آزاد جیسے مراکزِ ادب شامل ہیں۔ علمی حلقوں میں یہ اعتراف عام ہے کہ نئی نسل کے جن محققین نے اردو کے نامور محققوں کی یاد کو تازہ اور ان کی روایات کو زندہ رکھا ہے، فاضل مصنف کا شمار بھی ان ہی میں ہے۔ مگر اوقاف و علامات و مخففات کے موضوع پر ان کے تین مقالات و مباحث کا یہ مجموعہ، تحقیق میں ان کی انفرادیت پسند طبیعت کا غماز بن کر سامنے آیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ چند مضامین اور ایک دو رسالوں کے سوا اس موضوع یعنی تحریر و کتابت کے فنی اجزا پر کچھ نہیں۔ اگر کوئی سرسری گزرا بھی تو یہ کہہ کر کہ یہ باریکیاں املا سے تعلق رکھتی ہیں اور اسی حد تک ان کے بارے میں مختصر انداز سے کچھ بتا دیا گیا۔ کتاب کے مصنف نے قطعیت سے کہا کہ ان علامات اور وقف و ربط کے ان نشانات کا فی نفسہٖ اردو املا سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ سکتہ، ختمہ، وقفہ، رابطہ یا جمع، نفی، ضرب، تقسیم کی علامتوں کو دیکھ کر اور مخففات میں س، ش، ص، ع، ر، م وغیرہ کی تاریخ جاننے میں دلچسپی ہوتی بھی تو کیوں؟ مصنف نے بتایا کہ اس دماغی ورزش کا خیال سب سے پہلے رشید حسن خاں کو آیا جنھوں نے ان کی اصولی تقسیم کی۔ اسی اصول تقسیم کی تفصیل در تفصیل یہ کتاب ہے۔ کتابت اور

کمپوزنگ کی دنیا سے وابستہ اہل فن کے لیے اس کا مطالعہ اگر فرض ہے تو خود ہر قلم گیر کے لیے اس کا مطالعہ بدرجہ وجوب ہے۔ اور اگر تحیر سے نشاط حاصل کرنے کی صلاحیت طبیعت میں ہے تو عام قاری کے لیے ان مضامین کا مطالعہ استحباب کا درجہ تو رکھتا ہی ہے۔ کتاب میں محض تکنیکی زبان اور معلومات ہی نہیں۔ ان علائم و رموز کی تاریخ بھی ہے۔ سرسید سے ماقبل ومابعد اردو تحریر کی یہ تاریخ بڑی دلچسپ ہے اور بتاتی ہے کہ سرسید کے عہد میں توقیف نگاری کا رواج نہیں تھا، فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں اگر کچھ تھا تو جداگانہ اور متفرق۔ سرسید نے اس افتراق وانتشار کو جس طرح سمیٹنے اور سدھارنے کی کوشش کی، فاضل مصنف نے اس کی پوری داستان سنادی۔ رموزاوقاف میں اب عام طور سے کاما، سیمی کولن، ڈیش وغیرہ زبان زد ہیں۔ ان کے لیے سکتہ، سکون، زوج، مد، وقف کامل، استفہامیہ، دوواؤ معکوس جانبین، اقتباس وغیرہ الفاظ اب عجوبہ ہی لگتے ہیں۔ استفہامیہ کی علامت؟ کبھی اس طرح؟ تھی، سرسید نے الٹ کر موجودہ رخ دے دیا۔ ان معلومات سے شاید بحث کی خشکی دور کی گئی، ورنہ بحث تو غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ ایسی کتابیں اب اردو میں شاذ ہی شائع ہوتی ہیں۔ مصنف کا اس کے لیے دل سے شکر گزار ہونا چاہیے۔

(عمیر الصدیق ندوی)

عمران علی آبادی، ڈاکٹر انورحسین اور ان کی بکھری تحریریں: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۷۲، قیمت: ۴۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، پتہ: دانش محل امین آباد، لکھنؤ اور عمران علی آبادی، چھوٹا محل، پوسٹ آفس علی آباد، ضلع بارہ بنکی: ۲۲۵۴۰۱، اور کوثر حسین خاں، اظہر منزل نزد عید گاہ پوسٹ آفس نیورہ، ضلع ایودھیا: ۲۲۴۱۱۷، موبائل مصنف ۸۸۵۳۱۰۴۴۹۳۔

ڈاکٹر انورحسین خاں اودھ کی اس خاک سے اٹھے ہیں جس کی طینت میں حجابی اور شور و شہرت سے دوری و مستوری شامل ہے۔ وہ اردو کے کسی بھی ادارے سے روزگارانہ وابستہ نہیں ہیں، ملازمت غیر اردو ہے لیکن اودھ اور تعلقہ داری کی روایت باشرافت نے ان کو مادری زبان سے محبت اور ماں ہی کی طرح اردو کی خدمت کا جذبہ عطا کیا۔ بڑی خاموشی سے وہ قلم و قرطاس سے آشنائی کی رسم کو تقدس عطا کرتے رہے ہیں، مقالات و مضامین، افسانے و تبصرے، مراسلے ہر طرح وہ زبان ہی نہیں، اعلیٰ خیالات اور دیرینہ پاکیزہ علمی روایات کا مسلسل اظہار کرتے رہتے ہیں۔

ان کا مولد و موطن اور علاقہ و جاگیر، اودھ کے مشہور قصبہ ردولی کے نزدیک واقع ہے۔ حضرت شیخ العالم کی درگاہ اور ردولی کی مشہور زمانہ ادبی روایات نے ڈاکٹر صاحب کے فن اور فکر دونوں کو اہتمام و احترام کے مقام پر فائز کر دیا۔ عموماً اردو کے تعلق سے بڑے شہروں اور بڑے اداروں سے وابستہ خوش نصیب اشخاص کو شہرت و ناموری کی خلعتیں تلاش کرتی نظر آتی ہیں، گوشہ گیروں اور عزلت پسندوں سے نگاہیں، چرالی جاتی ہیں یا پھر وہ نظر انداز کرنے کے خانے میں فراموش کر دی جاتی ہیں۔ ایسے میں وہ لوگ قابل قدر ہیں جو ان شخصیتوں کے نقوش کو یکجا کرتے اور پھر ان سے اکتساب نور کی شمعیں روشن کرتے ہیں۔ اس کتاب کے لائق مرتب نے یہی فریضہ انجام دیا وہ خود اودھ کے ایک تاریخی قصبہ علی آباد سے تعلق رکھتے ہیں، انھوں نے نہایت سلیقے سے سات ابواب سے سجے ڈاکٹر انور حسین خاں کے قصر ادب کی سیر کرا دی۔ زیادہ تر تحریریں، خطہ اودھ کے شعراء و ادباء ہی کے تعلق سے ہیں۔ چودھری محمد علی ردولوی جیسے طرح دار ادیب و انشاء پرداز کو تو نئی زندگی ہی ان مضامین سے ملی، ردولی، نیورہ کی تاریخ اور فیض آباد کے دو قدیم اخباروں کا تعارف جیسے مضامین، تحقیق کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں پر تبصروں کو بھی ایک باب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ یعنی مصنف و مرتب میں لف و نشر مرتب کی خوبی بھی اپنا اعلان کرتی ہے۔ صالح اور شریف و متین ادب کے شیدائیوں کے لیے یہ کتاب صوری اور معنوی دونوں طرح دیکھنے اور پڑھنے کا لطف عطا کر سکتی ہے۔ (ع۔ص)

جہانگیر انس، میری بستی کے لوگاں: متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۴۰، قیمت: ۲۵۰ روپے، سن اشاعت درج نہیں، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد، دہلی۔ ۶ اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی اور علی گڑھ، پٹنہ، ممبئی، اورنگ آباد، کولکاتا وغیرہ کے مشہور مکتبے، موبائل نمبر: ۹۱۶۲۳۵۷۸۳۰

کتاب کے نام میں لوگاں سے لگا کہ یہ حیدرآباد دکن کی داستانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ بہار کے سیوان ضلع کی ایک چھوٹی سی بستی رانی پور کے کچھ ایسے باشندوں کی کہانی ہے جن سے شاید دنیا کی کوئی بستی خالی نہیں۔ یہ عام انسان ہوتے ہیں۔ نام کی پہچان کے باوجود یہ بے نشان لوگ، زندگی کی سچائیوں کا نشان ضرور ہوتے ہیں۔ سوانح اور تذکروں کی زینت بننے کی لیاقت و صلاحیت اور اس خاک سے بھی محروم ہو جو خاکوں میں ڈھل جاتی ہے۔ پھر بھی وہ یادوں میں بس

جانے والی خوبی سے یکسر محروم بھی نہیں ہوتے، اس کتاب میں ایک گمنام بستی کے چالیس سے زیادہ گم ناموں کو یاد کرنے کی خواہش کا اظہار جس معصومیت اور خلوص سے ہوا ہے وہ یادوں کی دنیا کو ایک خوش گوار احساس عطا کردیا گیا ہے، یہ خاکے ہیں یا بقول مصنف خاکہ نما ہیں۔ لیکن یہ سب خاک کے پردے میں نہاں بھی اور عیاں بھی۔ لکھنے والے ایک وظیفہ یاب معلم ہیں۔ اس لیے ایک معلم کی طرح انہوں نے مخدوم شاہ علاءالدین کی آباد کردہ بستی کی ساڑھے تین سو سالہ قدامت کا قصہ چھیڑ دیا اور اسے مشرقی تہذیب اور علم و ادب کا گہوارہ بتاتے ہوئے لکھا کہ اس گاؤں میں ہندوستان کے پہلے صدر راجندر پرشاد نے ابتدائی اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مصنف کی آنکھوں سے ماضی کے مناظر بھی گزرے اور اب موجودہ نقشہ بھی ان کی نگاہوں میں ہے۔ ایسے میں وقت کی لہروں پر بنتے بگڑتے دائروں کو پہچان کر ان کی تصویرکشی کا یہ عمل واقعی جاذب نظر اور پر اثر ہے۔ خاندان اور اساتذہ اور احباب تو یادوں کے لازمی کردار ہمیشہ سے رہے ہیں مگر بنگلیا جیسے کردار ہی سماج کا اصل آئینہ بنتے ہیں، لکھا کہ اس غریب مزدور کا پورا نام بنگالی رام تھا، لیکن مزدور کا نام کبھی پورا نہیں ہوتا۔ یہ کہتے کہتے ایسے جملے قلم کی زبان کو حیرت سے دیکھنے لگے کہ ”اپنے ملک میں انسان سے زیادہ مزدور پیدا ہوتے ہیں۔ ہر شے کو عروج و زوال ہے مگر مزدوروں کی زندگی ساکت و جامد ہے۔ مزدور مزدور ہی پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی بھر مزدور ہی رہتے ہیں اور ایک دن مزدور ہی دفن ہو جاتے ہیں“۔ بنگلیا مسلمانوں کے یہاں زیادہ کام کرتا تھا کہ ان کے ہاں اسے عزت ملتی تھی۔ ذات کے حوالے سے تحقیر نہیں ہوتی تھی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی لیکن سچی باتوں نے اس کتاب کو پڑھنے ہی نہیں، پسند کرنے کے لائق بنادیا ہے۔ انداز بیاں میں شوخی اور شگفتگی لیے ہوئے ہے جس سے یہ کتاب اس فن میں اچھی جگہ پانے کی مستحق بن گئی ہے۔ (ع۔ص)

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ناگپور میں اردو نثر نگاری، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۳۸۴، ملنے کا پتہ: ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور/۴۴۰۰۱۸ (مہاراشٹر)، سن اشاعت، ۲۰۲۴ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، ای میل: sahilcomputerngp@gmail.com

ناگپور کی علمی، ادبی، شعری، تحقیقی، تنقیدی، ملی اور اک گونہ سیاسی تاریخ کا انتہائی باریک بینی سے جائزہ صاحب کتاب نے اپنی متعدد تصنیفات میں لیا ہے۔ زیرنظر کتاب اسی زریں سلسلے کی توسیع اور ناگپور کے تقریباً ۵۶ ارباب ادب کے سوانحی حالات اور مختلف اصناف ادب ناول، افسانہ،

کہانی، منی افسانہ،ڈرامہ، انشائیہ،طنز ومزاح،سوانح وخاکہ نگاری، عروض،ترجمہ،شرح،صحافت اورفن خطاطی سے متعلق ان کی مطبوعہ تصانیف کا مرقع ہے۔بعض کے نثری کارناموں کاناقدانہ جائزہ اورآخرمیں بعض اہل قلم کے تحریری نمونے بھی شامل ہیں۔ملکی سطح پر اردوادب کی تاریخ میں ناگپور کانام جیسے آناچاہئے، نہیں آتا۔اس تصنیف کاایک مقصدناگپور کے ادیبوں اور نثرنگاروں کی طرف محققین کی توجہ مبذول کرانا بھی ہے۔ان کے بقول ناگپور میں اردونثرنگاری کا باقاعدہ آغازسید عبدالعلی عادل(۱۸۲۳۔۱۸۹۴ء) کےخطوط اور مذہبی مضامین سے ہوا۔(ص ۱۵) اس سے قبل مصنّف نے اپنی کتاب ناگپور میں اردو کاارتقائی سفرمیں مختلف اصناف ادب پر ۱۹۹۲ء تک شائع شدہ نثری تصانیف کی کل تعداد۴۹بتائی تھی، گذشتہ تیس برس کے عرصے میں مختلف اصناف ادب پر ان کی تحقیق کے مطابق ۱۸۳کتابیں منظرعام پر آئیں۔اس سے واضح ہے کہ ماضی کے مقابلے میں ناگپور کے اہل علم نے اردونثرنگاری کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔

ناگپور کے ان نثرنگاروں میں گیارہ خواتین کاتذکرہ بھی شامل ہے۔بوہرہ فرقے کی مشہور ترقی پسندافسانہ نگار زہرجبین کاتعلق ناگپور سے تھا۔ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے مشعل راہ اورنشیب وفراز بہت مشہور ہوئے ہیں۔انشائیہ وافسانہ نگارشفیقہ فرحت کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ اردوادب کی تاریخ میں وہ واحد خاتون ہیں جنہوں نے طنزومزاح کی صنف میں اپنے خیالات کابے باکی سے اظہار کیاہے(۹۹)حالانکہ اس میدان میں آصف جہاں اورانیس سلطانہ وغیرہ کے نام بھی معروف ہیں۔ایک ہندواديب لال چندرندھیر کے حالات بھی ہیں۔ان کے افسانوں کےمتعلق لکھا گیاہے کہ معیاری اور گہری سوچ پر مبنی ہیں(ص ۹۴۔۹۵)۔حاجی الٰہی بخش،علامہ شبلی کے تلمیذ مولوی محمود علی خاں ندوی، مشہور کتبہ شناس ضیاء الدین ڈیسائی اورمترجم ومفسر قرآن مولاناعبدالکریم پاریکھ وغیرہ کی ناگپور آمداوروہاں ان کی علمی سرگرمیوں کامفصل تذکرہ بھی ہے۔ تنقیدی جائزے پرمشتمل کتاب کاحصہ پڑھنے کے قابل ہے۔بالخصوص جہاں پرمصنّف نے سید عبدالعلی عادل کابہ حیثیت نثرنگار اور مولاناسید ابوالحسن ناطق کابہ حیثیت شارح دیوان غالب جائزہ لیا ہے۔عادل کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ لکھنوی طرزفکر کے دلدادہ تھے۔ان کے مضامین کے مطالعے کے بعد ان کی علمیت وذکاوت کوتسلیم کرناپڑتاہے۔انہوں نے آسان اور مشکل دونوں طرح کا اسلوب اختیار کیاہے۔لیکن زیادہ تردقیق، عربی وفارسی کے ثقیل الفاظ اور بھاری بھرکم ترکیبوں کااستعمال کرتے ہیں۔(ص ۱۸۲)مولانا ناطق داغ دہلوی کے تلامذہ میں تھے۔

کنزالمطالب کے نام سے دیوان غالب کی شرح لکھی تھی جس کو مقبول احمد لاری نے مقدمہ میں مفید اور غالبیات میں قابل قدر اضافہ قرار دیا تھا لیکن مصنّف کے مطابق اس کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہو سکا۔ مصنّف نے خود بھی اس شرح کا مفصل جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب کی شاعری کو سمجھنے کے لیے یہ شرح اہمیت کی حامل ہے (۲۱۸) لیکن اہمیت وافادیت کے باوجود کیا وجہ ہے کہ وہ نایاب ہے اور اب تک اس کا دوسرا ایڈیشن سامنے نہیں آسکا۔ اس سوال کا جواب کتاب میں نہیں ملا۔ کتاب اپنے موضوع پر مفید اور مصنّف کے عمدہ سلیقہ تلاش وتفحص کی غماز ہے۔ ناگپور کی ادبی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے محققین کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (کلیم صفات اصلاحی)

ڈاکٹر امام اعظم، یہی کولکاتا ہے (مختصر منظوم ادبی تاریخ)، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات: ۴۳۲، ملنے کا پتہ: تمثیل نو پبلی کیشنز، محلہ: گنگوارہ، پوسٹ: سارامو ہن پور: در بھنگہ، سن اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۸۹۰۲۴۹۶۵۴۵، ای میل: imamazm96@gmail.com

کلکتہ جس کا تلفظ اب کولکاتا ہے، مختلف افکار ونظریات، متعدد زبان وادب اور گوناگوں تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ کلکتہ کے لوگ اپنے عظیم الشان ماضی کی روایات پر اس قدر سختی سے کاربند ہیں کہ موجودہ منافرت کے ماحول کے اثر سے اس کی اکثریت ابھی بہت حد تک محفوظ ہے۔ زیر نظر کتاب ماضی وحال کی سماجی وتہذیبی ہم آہنگی اور باہمی مہر ومروت کی دلکش تصویر پیش کرتی ہے۔ مصنّف نے کتاب میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریر بہ عنوان "شہر نشاط کا آئینہ خانہ" پیش لفظ کے طور پر شامل کی ہے جس کے آخر میں لکھا گیا ہے کہ "زمینی خوشبو سے بھری تہہ دار یہ نظم دروں بینی کا بھی جادو جگاتی ہے اور حوالہ جاتی بنیادوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہے"۔ کولکاتا کی علمی وادبی تاریخ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن مصنّف نے تقریباً ۴۰ صفحات پر مشتمل نثری مقدمے میں اس کا جو مستند تاریخی، ادبی، علمی، معاشرتی اور ثقافتی مواد پیش کیا ہے وہ بجائے خود گراں قدر اور مثبت ادبی معلومات کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کے مطابق ہندو آریائی ہوں یا مسلم حکمراں سب یہاں آئے لیکن انگریزوں نے اس شہر کو دارالسلطنت بنایا اور اس کی تزئین وآرائش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انہوں نے اس کی منفرد شناختوں کی تفصیل بھی فراہم کی ہے۔ یہ منظوم ادبی تاریخ انہوں نے مغربی بنگال میں اردو کی تشفی بخش پیش رفت سے متاثر ہو کر رقم کی ہے۔ اس میں ان کی فکری وابستگی کے ساتھ ان کے جذبات بھی شامل ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ شاعر نے اپنی نظموں میں پورے کولکاتا کے ماضی وحال کی سیر کرادی

ہے۔ شہر کے عام مزاج، قدرتی مناظر، یادگار عمارتوں اور انگریزوں کے مظالم کا مجملاً کا تذکرہ کیا ہے۔ واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر کی مظلومانہ کیفیت کا اس میں بیان بھی ہے۔ کلکتہ اور اس کے مضافات کی ۲۷۹ علمی، ملی، ادبی، سیاسی شخصیتوں کا منظوم خاکہ ہی اصلاً کولکاتا کی مختصر منظوم ادبی تاریخ کا عنوان بن گیا ہے۔ جان گلکرسٹ، غالب، داغ اور ٹیگور وغیرہ کا کولکاتا سے تعلق کون نہیں جانتا۔ ان کے ذکر کے بغیر کولکاتا کی ادبی عظمت کی داستان کیوں کر مکمل ہوسکتی ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ شاعر نے ہر نظم کو اس شعر "ہاں وہی جو پہلے کلکتہ تھا / اب کولکاتا ہے" پر ختم کیا ہے۔ شہر نشاط کا یہ منظر نامہ کلاسیکل اور روایتی اسلوب و انداز کے بجائے آزاد نظم کے فارم میں پیش کیا گیا ہے اور ایک نظم بھی شاید روایتی انداز کی نہیں ہے۔ اس لیے روایتی شاعری کے دلدادہ طبقہ کو اس سے ممکن ہے کم ہی دلچسپی ہو۔ طویل نثری نظموں میں جہاں سخنوری کو حدود نثر میں داخل ہونے کا ہمہ وقت خطرہ رہتا ہے امام اعظم نے نہایت چابک دستی اور ہوشیاری سے یہ معرکہ سر کیا ہے۔ مصنّف نے کولکاتا سے اپنی عقیدت و محبت کے جو ترانے گائے ہیں ان میں تعریف کے ساتھ ساتھ کلکتہ اور کولکاتا کا حسین امتزاج بھی ہے۔ کتاب کی پہلی نظم کا ایک حصہ ملاحظہ ہو۔

از نگاہ تابہ خیال / جاگتا بوجھتا جاگتا اونگھتا / عالم میں بے نظیر / شہر جمال، شہر نگار / حیرت و استعجاب سے بھرا / جس کا ہر پہلو / کچھ نئی کچھ پرانی داستان سناتا ہے / ہاں وہی پہلے کلکتہ تھا / اب کولکاتا ہے۔

ہوڑہ برج کولکاتا کی شان اور شناخت ہے۔ امام اعظم اس کی مدح میں رطب اللسان ہیں۔

ماورائی خاکوں سے بھرا ہوا لوہے کا جال / جادوئی حکمت کا کمال / یا پھر کرشماتی ذہن کا پھیلاؤ / فاصلہ در فاصلہ مقناطیسی کنارہ / نیلے آسمان کی طرح۔

عبد الحلیم شرر نے مٹیابرج کو ثانئ لکھنؤ سے تعبیر کیا تھا۔ شاعر نے مٹیابرج پر اکیس مصرعے لکھے ہیں۔ چند اشعار میں اس کی قدیم و جدید تاریخ پیش کر دی ہے۔

مٹیابرج کی وراثت جو دکھاتی ہے / وجاہت اور نوابیت کی تصویر / شاہ اودھ واجد علی شاہ اختر نے اسے بنایا تھا / ثانئ لکھنؤ / اور یہ بن گیا اردو ادب کا ایک منفرد مرکز / لیکن اب اس میں آنسو زیادہ ہیں مسکان کم۔

یہ کتاب مصنّف نے انتقال سے محض دو مہینے قبل بھیجی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ امید ہے ان کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ منفرد اور غالباً آخری معنوی یادگار بھی دنیائے علم و ادب میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گی اور ان کے نام کو تادیر زندہ رکھے گی۔ (ک۔ ص اصلاحی)

غزل

وارث ریاضی
کاشانۂ ادب، سکٹا (دیوراج)، پوسٹ: بسوریا، وایا: لوریا، مغربی چمپارن، بہار ۸۴۵۴۵۳

خدا کے فضل سے امن و اماں کا پاسباں میں ہوں
کہ تعلیمِ رسولِؐ بحروبر کا ترجماں میں ہوں
مرے حسنِ عمل سے رونقِ گل زارِ ہستی ہے
جہانِ زندگی میں حاصلِ کون و مکاں میں ہوں
حقیقت میں یہ اعجازِ خدائے دین و دنیا ہے
فنا کی راہ پر ہوتے ہوئے بھی جاوداں میں ہوں
خرد کی سرحدوں سے ماورا ہستی تری یارب!
تری دنیائے حکمت میں مگر وہم وگماں میں ہوں
نہ مجھ کو جانتا کوئی، نہ ہے پہچانتا کوئی
جہانِ حکمت و دانش میں بے نام و نشاں میں ہوں
ہجومِ بے خودی میں، فرطِ غم میں، ناامیدی میں
جہاں پہنچا نہیں ہے آج تک کوئی، وہاں میں ہوں
سمجھ میں آ نہیں سکتیں الٰہی! حکمتیں تیری
تخیل عرش پر ہے اور زیرِ آسماں میں ہوں
یہ کیسی بے رخی؟ یہ بے نیازی، ہائے رے قسمت!
سرِ محفل بھی رہ کر ان کی نظروں سے نہاں میں ہوں
جو میرے ساتھ چلتے ہیں، بھٹک جاتے ہیں منزل سے
نہ جانے کون سی منزل کا میرِ کارواں میں ہوں
ارادے ہیں مرے مضبوط ، محکم حوصلے میرے
بہ ایں پیری مجھے احساس ہوتاہے، جواں میں ہوں
مسلسل اَوج پر کارِ ستم گاری ہے دنیا میں
خود اپنے گھر میں بھی برسوں سے وارثؔ! بے اماں میں ہوں

نوحۂ یتیم

خالد ندیم
سرگودھا، پاکستان
dr.khalidnadeem@gmail.com

کسی دِن لَوٹ آنے کا اگر امکان رہ جاتا
ہماری زندگی میں بھی کچھ اطمینان رہ جاتا

چلو مانا کہ مجبوری تھی اور جانا ہی ٹھہرا تھا
مروّت میں ہی دو دِن کے لیے مہمان رہ جاتا

تو کیا دنیا جہاں کی نعمتوں کی آرزو کی تھی؟
مگر اتنی کہ میرے سر پہ سائبان رہ جاتا

اجل! دو چار برسوں کی اگر تاخیر ہو سکتی
تمھاری بات رہ جاتی ، ہمارا مان رہ جاتا

کبھی جب امتحاں آتا ، مشقت بھی اُٹھا لیتے
نصابِ زندگی تو کچھ نہ کچھ آسان رہ جاتا

خدا کا شکر ہے ، یادیں تمھاری آتی رہتی ہیں
وگرنہ باغِ ہستی کس قدر ویران رہ جاتا

کبھی فرصت ملِے تو اس حقیقت کو سمجھ ، ناداں!
نہ ہوتی موت اگر ، اِنسان کیا اِنسان رہ جاتا؟

معارف ـــــ کی ڈاک

فاحش اور فحش غلطیاں

معارف کی ڈاک کے زمرے میں میرا ایک تبصراتی خط، فروری ۲۰۲۵ میں شائع ہوا جس میں میرے مسودے میں لکھی عبارت ”تین فاحش غلطیاں“ کو معارف کے پروف خوان[1] نے ”تین فحش غلطیاں“ میں بدل دیا۔ اس پر میں نے آپ کو بذریعہ ایمیل متوجہ کیا کہ یہاں فاحش کا مقام ہے فحش کا نہیں۔ آپ نے بذریعہ ایمیل جواب دیا، میں نے پڑھ لیا اور بات ختم ہو گئی۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ معارف، مارچ ۲۰۲۵ کے شمارے میں آپ نے وہ برقی مراسلت شائع کر دی ہے اور حاشیے میں اپنے موقف کی تقویت کے لیے اردو کے ایک ماہر کی رائے بھی چھاپ دی ہے جو فرماتے ہیں انھوں نے کبھی 'فاحش غلطیاں' نہ سنا نہ لکھا ہوا دیکھا۔ چاہیے تو یہ تھا زبانی رائے لینے کی بجائے کسی فرہنگ سے استناد کیا جاتا کہ فاحش غلطیاں لکھنا غلط ہے۔ اب معاملہ چونکہ عام ہو گیا ہے تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس بحث کو کتب لغات سے مستند کیا جائے۔ اگر محض زبانی رائے لے کر جواب دینے کا معاملہ ہوتا تو میں بھی کہہ سکتا تھا کہ میں نے کچھ جیّد ماہرین زبان سے اس لفظ کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی ہے تو ان کا جواب یہی تھا کہ فاحش غلطی یا فاحش غلطیاں ہی درست ہے کیوں کہ میرے خط میں اس لفظ کو (کھلا، ظاہر، آشکارا) مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اردو میں ایک ترکیب عام طور پر 'شکست فاش' لکھی جاتی ہے جو مستند فرہنگوں میں 'شکست فاحش' درج ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر ہم اسے 'شکست فحش' میں بدل دیں تو کیا مضحکہ خیز نہیں ہو گا؟

اب میں چند قدیم و جدید اردو اور فارسی فرہنگوں سے 'فاحش' کے معانی نقل کرتا ہوں جو میرے موقف پر منطبق ہوتے ہیں۔ اردو لغت بورڈ، کراچی کی مرتبہ اور شائع کردہ **اردو لغت تاریخی اصول پر** میں فاحش کے ایک معنی فاش، کھلا، ظاہر، آشکارا کے لیے اردو کے قدیم متون سے

---

[1] آپ کے پروف خوان کا کرشمہ ہے کہ وہ بیک جنبش قلم جو چاہیں بدل دیں، اب مارچ ۲۰۲۵ کے معارف میں انھوں نے اپنی طرف سے میری سکونت لاہور لکھ دی ہے۔

جو اسناد پیش کی ہیں وہ بھی نقل کر دی ہیں۔ **فرہنگ آصفیہ** اور **نوراللغات** میں 'فاحش غلطی' کی مثال موجود ہے۔ فارسی فرہنگوں سے بھی دو حوالے دیئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد معین نے ' غلط فاحش' لکھ کر اس کا مطلب بہت اہم اور شرمناک غلطی درج کیا ہے۔ فاحش اصل میں عربی لفظ ہے اور آپ اپنے جواب میں لکھ ہی چکے ہیں کہ عربی میں بھی فاحش لکھا جاتا ہے جیسے اخطاء فاحشۃ۔ قصہ کوتاہ یہ کہ عربی، فارسی، اردو میں فاحش غلطی، کھلی اور واضح غلطی کے مفہوم میں مستعمل ہے۔

اردو لغت تاریخی اصول پر: فاحِش: ا۔ حد سے گزرنے والا، بدکار، بدی میں حد سے گزر جانے والا، فاسق و فاجر، ۲۔ شرمناک، حیا سوز، ۳۔ فاش، کھلا، ظاہر، آشکارا. اس کے تیسرے مفہوم کے لیے اردو لغت میں نظم و نثر سے جو اسناد دی گئی ہیں وہ یہ ہیں:

کیا یہ جورِ فاحش ہے اے کوفیان بے وفا

کیا یہ ظلمِ ظاہر ہے اے شامیان شوم رُو[۲]

(۱۷۳۲ء، کربل کتھا، ۲۳۰)

"اب تو تجھ پر میرا راز کھل گیا پردہ فاحش ہو گیا، میرے حق میں تو جو چاہے سو کر مختار ہے۔" (۱۸۰۳ء، گل بکاؤلی، ۸۷)

"اور بڑے بڑے مناظروں میں بودھوں کو شکست فاحش دی ہے۔" (۱۹۴۵ء، تاریخ ہندی فلسفہ، ا: ۱۹۴)

فرہنگ آصفیہ: فاحِش (عربی، صفت)، ا۔ بدی میں حد سے گزر جانے والا، بدکار، از حد ابد یا بُرا، ۲۔ وہ بدی جو حد سے گزر جائے، ۳۔ مردِ زشت سخن، گالیاں بکنے والا، ۴۔ مجازاً شرمناک، قابل شرم جیسے فاحش غلطی یا فاحش شکست، مجازاً بھاری، قبیح.

فرہنگ عامرہ: فاحِش، حد سے بڑھ کر برائی، حد سے بڑھ کر بُرا۔

لغات کشوری: فاحِش، بدی میں حد سے گذرنے والا، ہر بدی جو حد سے گذر جائے۔

جدید نسیم اللغات: فاحِش، شرمناک، ڈوب مرنے کے قابل (جیسے شکست فاحش)

---

[۲] یہ دراصل ایک فارسی شعر کا لفظی ترجمہ ہے جس میں 'جورِ فاحش' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے:

این چہ جور فاحش است اے کوفیان بے وفا

این چہ ظلم ظاہر است اے شامیان شوم روی

نور اللغات: فاحش (عربی)، بدی میں حد سے گزرنے والا، سخت گناہ، صفت، مجازاً شرمناک، بھاری، قبیح، جیسے فاحش غلطی، فاحش شکست.

فارسی فرہنگوں میں سے:

لغت نامۂ دہخدا: دیگر معانی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے: کثیر، غالب، ہرچہ از حد تجاوز کند، بسیار و زیادہ از اندازہ.

فرہنگ فارسی از محمد معین (فارسی): فاحش (عربی، صفت)، ۱۔ زشت، قبیح؛ ۲۔ آنچہ از حد تجاوز کند؛ زیاد از حد، بسیار کثیر، تفاوت فاحش یعنی تفاوت زیاد، غلط فاحش یعنی غلط بسیار مہم و فاضح، ۳۔ بے شرف، ۴۔ جسور، گستاخ

عارف نوشاہی، اسلام آباد
۲ مارچ ۲۰۲۵
naushahiarif@gmail.com

مقام مسرت ہے کہ آپ نے قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ "دی گلوریس قرآن" کے نام سے کیا ہے۔ اس عظیم دینی و علمی کارنامے پر میں آپ کو تہہِ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں، اس ترجمے نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ آپ کی ذات گرامی الولد سر لابیہ کی مصداق ہے۔

آج میں آپ کو ایک بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں: آپ نے بہت سے علمی معرکے سر کیے ہیں، اب آپ کو پہلے سے زیادہ دارالمصنّفین کی ترقی اور معارف کے معیار کی بلندی کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ دارالمصنّفین کی علمی خدمات اور معارف کے معیار کی طرف انگشت نمائی کا موقع نہ ملے۔

وارث ریاضی، مغربی چمپارن، بہار
۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

''شبلی شکنی کی روایت: پس منظر و پیش منظر''

معارف فروری ۲۰۲۵ء میں ڈاکٹر خالد ندیم کا مضمون ''شبلی شکنی کی روایت: پس منظر و پیش منظر'' نظر نواز ہوا۔ مضمون کافی معلوماتی ہے لیکن اس طرح کے پرانے موضوعات کو چھیڑنا اب مناسب نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ ان پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے[۱]۔ اس پر مزید یہ ہے کہ سید شہاب الدین دسنوی نے اپنی کتاب ''شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں'' کے اندر اس طرح کے سارے الزامات کا مسکت جواب دیا ہے[۲]۔

ڈاکٹر خالد ندیم صاحب نے اپنے اس مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے:

> یقیناً اقبال احمد خاں سہیل علمی و ادبی اعتبار سے اس مقام پر فائز نہ تھے کہ ان کی کسی تحریر سے دنیائے ادب میں ارتعاش پیدا ہوتا، اس لیے علی گڑھ یا سر سید کے حلقے سے ان کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا، جب کہ سید سلیمان ندوی اپنی شخصیت اور اپنے علمی و ادبی مقام و مرتبہ کے لحاظ سے ہندوستان بھر میں مذہب، سیاست، تہذیب اور علم و ادب کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ اس لیے حیات شبلی کے مندرجات سے وہ مدّ و جزر پیدا ہوا کہ اس کی لہریں ایک صدی بعد بھی محسوس کی جا سکتی ہیں[۳]۔

ڈاکٹر صاحب کے یہ خیالات محلّ نظر ہیں۔ علامہ اقبال احمد خاں سہیل علی گڑھ کے پروردہ تھے۔ اس معاملے میں ان کی حیثیت 'رب البیت'[۴] کی تھی کیوں کہ انہوں نے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ ہی سے حاصل کی تھی۔ ان کے معاصرین میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور رشید احمد صدیقی وغیرہ جیسے مشاہیر ان کی صلاحیت کے حد درجہ قائل تھے۔

---

[۱] ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، کتابیات شبلی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۱ء میں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

[۲] سید شہاب الدین دسنوی، شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۔

[۳] شبلی شکنی کی روایت: پس منظر اور پیش منظر، از ڈاکٹر خالد ندیم معارف فروری، ۲۰۲۵ء، ص ۵۸۔

[۴] صاحب البیت ادریٰ بالذی فیہ (عربی مثل)

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ چاہتے تھے کہ سیرتِ شبلی مولانا عبد السلام ندوی یا پھر علامہ اقبال احمد خاں سہیل ہی لکھیں۔ اس کی وجہ سید صاحب نے خود یہ لکھی ہے:

خاک سار نے سیرت کی مصروفیت اور خاندانی اور ابتدائی حالات سے عدم واقفیت کے سبب اس کام کو پہلے اپنے رفیق شریک کار عبد السلام صاحب ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے برادری اور ہم وطنی کا تعلق رکھتے ہیں، اس لیے یہ کام مجھ سے بہتر انجام دے سکتے تھے...... مولوی اقبال احمد صاحب سہیل، ایم اے، ال، ال، بی، ایم ایل، اے وکیل اعظم گڑھ کے سپرد کیا گیا کہ وہ مولانا کے خاندانی تعلقات اور قدیم واقفیت کی بنا پر بہت کچھ لکھنے کے اہل تھے، چنانچہ انہوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مولوی عبد السلام صاحب کے مسودہ کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڑھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زور قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی[۵]۔

سید صاحب کا یہ اعتراف اس پر شاہد ہے کہ علامہ اقبال احمد خاں سہیل اس کام کے بالکل اہل تھے۔ یہ بات قطعی درست نہیں ہے کہ ”یقیناً اقبال احمد خاں سہیل علمی وادبی اعتبار سے اس مقام پر فائز نہ تھے کہ ان کی کسی تحریر سے دنیائے ادب میں ارتعاش پیدا ہوتا، اس لیے علی گڑھ یا سر سید کے حلقے سے ان کا کوئی نوٹس نہ لیا گیا“۔

اس کی ایک توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ علامہ اقبال احمد خاں سہیل کی 'سیرت شبلی' ماہنامہ الاصلاح سرائے میر میں شائع ہو رہی تھی۔ یہ رسالہ قرآنیات اور فکر فراہی کی ترویج کے لیے نکالا گیا تھا، اور اس رسالے کی کل عمر ابھی تین برس کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ وہ بعض وجوہ کی بنا پر بند ہو گیا، اور سیرت شبلی کی محض ۱۵ قسطیں ہی شائع ہو سکیں۔ یہ رسالہ اگر مزید جاری رہتا تو قوی امکان تھا کہ یہ کتاب بھی مکمل ہو جاتی۔

اس ضمن میں ایک دوسری بات بھی لائق توجہ ہے کہ مولانا شبلیؒ کا سر سید کی لائف 'حیاتِ جاوید' پر یہ تبصرہ کہ یہ مکمل مداحی ہے، مخالفین شبلی پر اس قدر شاق گزرا کہ جیسے ہی 'حیات شبلی' منظر عام پر آئی ناقدین شبلی جو بڑی بے چینی سے حیات شبلی کے منتظر تھے، انہیں ماحول کو گرمانے کا ایک موقع ہاتھ لگ گیا۔ اور اس نتیجے میں شبلی کی کردار کشی کی فضا ہموار کی گئی۔

---

[۵] مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۸ء، ص ۵۔

اسی طرح ڈاکٹر خالد ندیم کا یہ خیال بھی محل نظر معلوم ہوتا ہے کہ سید سلیمان ندوی کی طرف سے علی گڑھ اور سر سید کے متعلق شبلی کے خیالات کی ترتیب ہی اصل وجہ تنازع قرار پاتی ہے[۶] ......یہ خیالات اصلاً مولانا اقبال سہیل کے تھے نہ کہ سید صاحب کے، جیسا کہ اس باب میں سید صاحب ''سیرت شبلی'' سے جگہ جگہ استفادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

خالد ندیم نے مزید لکھا ہے کہ '' ان کو مجرم ثابت کرنے میں ان کے ممدوح (سید سلیمان ندوی) کے قلم کی کرامات تھیں''[۷]۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ گمان محض غلط فہمی پر مبنی ہے اور سید صاحب جیسے لائق جانشین کے بارے میں ان کے استاذ علامہ شبلی کی اس اہم وصیت و اعتماد ''افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے، کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا''[۸] سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''...اور دوسری جانب اعظم گڑھ کانگریس کی طرف جھکاؤ، جس کا واضح ثبوت دارالمصنفین میں کانگریسی رہ نماؤں کی مہمان نوازی سے ملتا ہے''[۹]۔ دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی نعمانیؒ خود ملک کے تئیں مسلم لیگ کی پالیسی سے سخت اختلاف رکھتے تھے، اور یہاں کانگریسی رہ نماؤں کی مہمان نوازی مسلم لیگ کی مخالفت میں نہیں بلکہ ملک کی موجودہ صورت حال میں کانگریس کی ہندو و مسلم اتحاد کی فضا کو پروان چڑھانے کی تائید و نصرت میں تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ مولانا تھانوی کٹر مسلم لیگی تھے، نہ کہ کانگریسی۔ اس لیے ان کی دلیل ''مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاتھ پر سید سلیمان ندوی کی بیعت''[۱۰] اس ضمن میں مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اس پر فقط سید صاحب کا اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے:

---

[۶] معارف، فروری ۲۰۲۵، ص ۵۰۔

[۷] ماخذ سابق، ص ۵۱

[۸] حیات شبلی، ص ۴

[۹] ماخذ سابق، ص ۵۳

[۱۰] معارف، فروری ۲۰۲۵ء، ص ۵۱

یہ لوگ زبان سے تو مجھ کو فاضل و محقق کہتے ہیں، مگر درحقیقت بے عقل جانتے ہیں۔ وہ اس پر کیوں غور نہیں کرتے کہ ان کے خیال کے مطابق اگر میں واقعی علامہ و محقق ہوں تو کیا بلا سوچے اور سمجھے مولانا اشرف علی کا دامن تھاما ہے۔ میں نے اپنے اندر کوئی کمی پائی جس کی تکمیل کے لیے ان کی طرف رجوع کیا[۱۱]۔

ماہنامہ آج کل دہلی ستمبر ۱۹۶۳ میں عطیہ فیضی کے دو خطوط علامہ شبلی کے نام چھپے ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر بتا رہا ہے کہ وہ شبلی کو اپنا استاذ اور بزرگ سمجھتی ہیں۔ خط کا انداز ملاحظہ کریں:

مکرم و محترم جناب مولانا دام مجدکم

تسلیمات عرض خدمت ہے۔ آپ کے دو مشرف نامے اور کتابیں برابر مل گئیں۔ حضور عالی اور بہن جان کل تشریف لائے بمبئی اور اسی وقت بہن جان کا مال ان کو دیا۔ اس قدر خوش ہوئیں کہ کیا عرض کروں۔ کہنے لگیں کہ دنیا میں کوئی چیز اس سے بڑھ کر مقبول نہیں ہو سکتی تھی۔ بہت ادب کے ساتھ آپ کا بہت احسان مانتی ہیں۔

عاجزہ

عطیہ

مڑگاؤں، بمبئی

۲۱؍فروری ۱۹۲۵ء

دوسرا خط[۱۲] بھی اسی انداز احترام کا ملتا ہے:

محترم جناب مولانا شبلی صاحب

زمانہ ہو گیا کہ آپ کی طرف سے کوئی خبر نہیں ہے۔

ہمشیرہ جان سے سنا ہے کہ شعر العجم حضور کے پاس آچکا ہے۔ میں نے ابھی نہیں دیکھا۔ آج کل سروجنی نائیڈو بھی یہاں ہیں اس سے لطف دوچند رہتا ہے۔ انگریزی میں عمر خیام باتصویر نکلی

---

[۱۱] حیات سلیمان، ص ۵۴۱

[۱۲] ۳۰؍مارچ سنہ درج نہیں ہے البتہ غالب گمان ہے کہ یہ خط بھی ۱۹۰۸ء کا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ شعر العجم اول ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ یہ کتاب مطبع فیض عام علی گڑھ سے شائع ہوئی (آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ۲۰۱۳ء، ص ۲۴۴۔

ہے، آپ نے اس نسخے کو دیکھا ہے؟ ضرور دیکھئے اور کسی انگریزی داں سے کہیے کہ آپ کو ترجمہ کر کے سنائیں۔

امید ہے آپ کا مزاج بہت اچھی طرح سے ہے۔

عاجزہ

عطیہ

مذکورہ بالا دونوں خطوط کا انداز بتارہا ہے کہ مولانا کا عطیہ فیضی، ان کی بہن اور ان کے گھرانے سے تعلق محض علمی تھا اور مولانا کی حیثیت اس گھرانے کے لئے گویا ایک علمی سرپرست کی تھی۔

خلاصۂ بحث یہ کہ عطیہ کو مسز عطیہ بنانے میں علامہ شبلی نعمانی کا بڑا کردار رہا ہے۔ مولانا چاہتے تھے کہ جس طرح سروجنی نائیڈو ایک غیر مسلم آئیڈیل خاتون ہیں، ایسے ہی مسلمانوں میں اگر عطیہ فیضی جیسی چند خواتین پیدا ہو جائیں تو مسلم لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک نمونہ سامنے ہو گا۔

فضل الرحمٰن اصلاحی

islahi1980@gmail.com

۲۱ر فروری ۲۰۲۵ء کو گاندھی نگر میں گجرات کے وزیر اعلیٰ کی صدارت میں گجراتی اور کچھی کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ اردو کے ایک جوان اور چار بزرگ شاعروں اور ادیبوں کو بھی گورو پرسکار سے نوازا گیا۔ انعام میں سند، شال اور ایک لاکھ روپے کی رقم شامل ہے۔ انعام یافتگان حسب ذیل ہیں:

(۱) پروفیسر مقصود احمد (برائے ۲۰۲۰ء) (۲) جناب ریاض لطیف (برائے ۲۰۲۱ء)

(۳) جناب شفاعت قادری (برائے ۲۰۲۲ء) (۴) جناب ستین دیسائی (برائے ۲۰۲۳ء)

(۵) جناب سفیان صادق پٹھان (برائے ۲۰۲۲ء)

گجرات کی حکومت کا یہ اقدام اس لیے لائق ذکر وتحسین ہے کہ اس سے گجرات کے اردو شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہو گی اور اردو کی ترقی بھی ہو گی۔

پروفیسر مقصود احمد مقصود، وڈوڈرا (بڑودہ)

موبائل نمبر: ۹۸۲۴۰۳۳۰۱۷

رسید کتب موصولہ

نیاز جیراجپوری، باغ (غزلوں کا مجموعہ): پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، صفحات: ۲۰۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۸۹۴۵۶۷۸۶

پروفیسر شریف حسین قاسمی، تاریخ جامع مشائخ دہلی (فارسی): نور انٹرنیشنل میکرو فیلم سینٹر، کلچر ہاؤس، اسلامک پبلک ایران، نئی دہلی، صفحات: ۴۸۵، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، موبائل نمبر: درج نہیں۔

فرحان بارہ بنکوی، تذکرۂ اسلافِ بارہ بنکی: مکتبہ النور، دیوبند، صفحات: ۳۲۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۴۵۰روپے، موبائل: ۹۹۳۵۴۹۹۹۸۳

مفتی سید آصف الدین ندوی، حیات انقلاب ڈاکٹر محمد قطب الدین ابو شجاع حیات و خدمات: انسٹی ٹیوٹ آف عربک اسٹڈیز، قادر باغ نانل نگر، حیدر آباد، صفحات: ۱۶۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۴۹۶۱۱۶۸۶

حکیم عبد الوحید اشک بجنوری، حکیم مصباح الدین اظہر (مرتب)، رباب (شعری مجموعہ مع مضامین)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ، صفحات: ۳۱۹، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۹۱۱۹۱۸۱۱۳

شکیل انور، شعریات شکیل: بک امپوریم، پٹنہ، صفحات: ۹۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۰۴۸۸۸۷۳۹

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، غالب اعظم شعراءِ الهند (عربی): فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیوٹ لمیٹڈ، ابو الفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۱۴۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۱۸۱۲۰۶۶۹

محمد ناصر سعید اکرمی، مکتوبات مرشد امت (مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی): معہد الامام حسن البنا بھٹکل، صفحات: ۴۳۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۸۰روپے، موبائل نمبر: ۹۹۰۲۱۰۵۳۰۰

حکیم سید ظل الرحمٰن، منظوم تاریخ خاندان: ابن سینا اکاڈمی، تجارہ ہاؤس، دودھ پور، علی گڑھ، صفحات: ۱۳۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: ۲۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۱۶۵۴۹۶

محمد عارف اصلاحی، ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم: البدر بک سینٹر، سرائے میر، اعظم گڑھ، صفحات: ۲۰۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۶۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۹۵۹۱۴۳۴

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی و علمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

APR 2025 Vol- 212(04) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org